ادبی نمونے

ایجوکیشنل بُک ہاؤس، علی گڑھ

EBH

ادبی نمونے

مُرتّبہ

ڈاکٹر نورالحسن نقوی

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی

EBH

ایجوکیشنل بُک ہاؤس

مُسلم یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۱

(برائے پری یونیورسٹی لازمی اردو)

ایڈیشن ------ ۱۹۸۰
تعداد ------- ۱۰۰۰
قیمت ------ ۷/۰۰

مطبع : اسرار کریمی پریس، الہ آباد
کتابت : سہیل احمد، الہ آباد

ایجوکیشنل بُک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

فہرست

حصّہ نثر

۱	غالبؔ	خطوط	۷
۲	حالیؔ	غالبؔ کے اخلاق وعادات	۱۱
۳	شبلیؔ	سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر	۲۱
۴	سرسید	امید کی خوشی	۲۸
۵	نذیر احمد	خود غرض دوست	۳۳
۶	محمد حسین آزاد	نور جہاں	۴۰
۷	حسن نظامی	گل بانو	۴۳
۸	پطرس	مرحوم کی یاد میں	۴۸
۹	پریم چند	گلی ڈنڈا	۶۳
۱۰	ابو الکلام آزاد	قولِ فیصل	۷۰
۱۱	فرحت اللہ بیگ	ایک وصیت کی تعمیل	۷۳
۱۲	احتشام حسین	ادب اور تہذیب	۸۳

حصّہ نظم

۱	میرؔ: غزلیں	ہستی اپنی حباب کی سی ہے	۹۱
		عمر بھر ہم رہے شرابی سے	۹۱
		جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا	۹۱

		سحر گہ عید میں دورِ سبو تھا	۹۲
	غالب : غزلیں	سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں	۹۲
		دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے	۹۲
		آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک	۹۳
		ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے	۹۴
۳	مومن : غزلیں	ٹھانی تھی جی میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم	۹۴
		ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے	۹۴
۴	فانی : غزلیں	دیر میں یا حرم میں گذرے گی	۹۵
		شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا	۹۵
۵	نظیر اکبر آبادی	بنجارہ نامہ	۹۶
۶	اکبر الہ آبادی	نغمۂ حسرت	۹۷
۷	اقبال	شعاعِ امید	۹۸
۸	چکبست	خاک ہند	۹۹
۹	جوش	رقیب فرشتے	۱۰۱
۱۰	فیض	ہم لوگ	۱۰۲
۱۱	ن ۔ م ۔ راشد	زنجیر	۱۰۳

حصّہ نثر

اسد اللہ خاں غالب

خطوط

بنام میر سرفراز حسین

نور چشم راحت جان میر سرفراز حسین جیتے رہو۔

تمھارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا جو بوئے پیرہن نے یعقوبؑ کے ساتھ کیا تھا۔ میاں یہ ہم تم بوڑھے ہیں یا جوان ہیں، توانا ہیں یا ناتواں ہیں بڑے بیش قیمت ہیں یعنی بہر حال غنیمت ہیں۔ کوئی جلا بھنا کہتا ہے:

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ　　یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

وہی بالاخانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ میر سرفراز حسین آئے، وہ یوسف مرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا۔ بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے نہیں۔ اللہ اللہ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوا۔ میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا۔

سنو غالب! یہ رونا پیٹنا کیا۔ کچھ اختلاط کی باتیں کرو۔ کہو میر سرفراز حسین سے کہ یہ خط میر مہدی کو پڑھواؤ اور میرن صاحب کو بلاؤ۔ کل شام کو یا پرسوں شام کو میر اشرف علی صاحب میرے پاس آئے تھے۔ کہتے تھے کہ کل یا پرسوں پانی پت کو جاؤں گا۔ میں نے ان کی زبانی کچھ پیام میرن صاحب کو بھیجا ہے۔ اگر بھول نہ جائیں گے پہنچائیں گے۔ میر مہدی صاحب سارا خط پڑھ کر کہیں گے مجھ کو دعا بھی نہ لکھی۔ بھائی میری دعا پہنچے۔ میرن صاحب کے نام تو اتنا کچھ پیام ہے دعا سلام کی حاجت کیا۔ دیکھو ہم اپنا نام نہیں لکھتے، بھلا دیکھیں تو سہی تم جان جاتے ہو کہ یہ خط کس کا ہے۔

بنام میر مہدی حسین مجروحؔ

اے جناب میرن صاحب! السّلام علیکم

حضرت آداب

کہو صاحب، اجازت ہے مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟

حضور! میں کیا منع کرتا ہوں میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں، بخار جاتا رہا ہے، صرف پیچش باقی ہے، وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں آپ پھر کیوں تکلیف کریں۔

نہیں میرن صاحب! اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خفا ہوتا ہوگا جواب لکھنا ضرور ہے۔

حضرت، وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے خفا کیا ہوں گے۔

بھائی، آخر تم کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو۔

سبحان اللہ۔ اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔

اچھا تم باز نہیں رکھتے۔ مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں۔

کیا عرض کروں، سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جائے۔ میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں میری روانگی کے تین دن کے بعد آپ شوق سے خط لکھیے گا۔

میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو۔ تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ، میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی، تمہاری باتوں میں آگیا اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ۔

سنو میر مہدی صاحب، میرا کچھ گناہ نہیں، میرے خط کا جواب لکھو۔ حالات یہاں کے مفصّل میرن صاحب کی زبانی معلوم ہوں گے۔ دیکھو بیٹھے ہیں کیا جانوں حکیم میر اشرف علی میں اور ان میں کچھ کونسل تو ہو رہی ہے۔ پنجشنبہ روانگی کا دن ٹھہرا تو ہے۔ اس وقت پہلے تو آندھی چلی پھر مینہ آیا۔ اب مینہ برس رہا ہے۔ میں خط لکھ چکا ہوں۔ سرنامہ لکھ کر رکھ چھوڑوں گا جب ترشح موقوف ہو جائے گا تو کلیان ڈاک کو لے جائے گا۔ میر سرفراز حسین کو دعا پہنچے۔

غالب

بنام یوسف مرزا

یوسف مرزا! تجھ کو کیونکر لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں تو پھر کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں، اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سر و پا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔ تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ یہ بات سچ ہے؟ اگر سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دو قیدوں سے چھوٹ گیا نہ قید حیات رہی نہ قید فرنگ۔

غالب

بنام نواب امین الدین احمد خاں

بھائی صاحب! آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحب قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں۔ تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں۔ اظہارِ غم، تلقینِ صبر، دعائے مغفرت۔ سو بھائی اظہارِ غم تکلف محض ہے۔ جو غم تم کو ہوا ہے ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو۔ تلقینِ صبر بے دردی ہے۔ یہ سانحۂ عظیم ایسا ہے جس نے غمِ رحلت نواب مغفور کو تازہ کیا پس ایسے موقع پر صبر کی تلقین کیا کی جائے۔ رہی دعائے مغفرت۔ میں کیا اور میری دعا کیا مگر چونکہ وہ میری مربیہ اور محسنہ تھیں دل سے دعا نکلتی ہے۔ تمھارا یہاں آنا سنا جاتا تھا اس واسطے خط نہ لکھا۔ اب جو معلوم ہوا کہ دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے اس سبب سے آنا نہ ہوا، یہ چند سطریں لکھی گئیں۔ حق تعالیٰ تم کو سلامت اور تندرست اور خوش رکھے۔

تمھاری خوشی کا طالب

غالب۔ ۱۵ر نومبر ۱۸۶۶ء

بنام علاء الدین احمد خاں

جانِ غالب! سنو عالم دو ہیں۔ ایک عالم ارواح ایک عالم آب و گل اور حاکم

ان دونوں عالموں کا ایک ہے۔ ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ کو میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکمِ دوامِ حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکرِ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار۔ مشقتِ مقرری اور مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں۔ سالِ گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دو ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی حکمِ رہائی دیکھیے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد نجات سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا۔

غالب

الطاف حسین حالی

غالبؔ کے اخلاق و عادات

مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا، بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے جو شخص ایک دفعہ ان سے مل آتا تھا اس کو ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے اور ان کی خوشی سے خوش اور ان کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اس لیے ان کے دوست ہر ملت اور ہر مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے۔ جو خطوط انھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں ان کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت غم خواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے۔ ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمے فرض عین سمجھتے تھے۔ ان کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ وہ دوستوں کی فرمائشوں سے کبھی تنگ دل نہ ہوتے تھے۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمائشیں ان کے بعض خالص و مخلص دوست کرتے تھے اور وہ ان کی تعمیل کرتے تھے۔ لوگ اکثر بیرنگ خط بھیجتے تھے مگر ان کو کبھی ناگوار نہ گزرتا تھا۔ اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیجتا تھا تو سخت شکایت کرتے تھے۔

مروت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجۂ غایت تھا۔ باوجودیکہ آخر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے۔ بایں ہمہ کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجالایا۔ اوراقِ اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب آنکھ سے اچھی طرح سوجھے نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔

کہتے ہیں کہ شاہ شرف بو علی قلندر کو بہ سبب کبر سنی کے خدا نے فرض اور پیغمبر نے سُنت معاف کر دی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست بھی خدمتِ اصلاح اشعار سے

مجھے معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا لکھ دیا کروں گا۔"

باوجود اس کے بھی لوگ مرزا کو برابر ستاتے رہتے تھے۔

ایک دفعہ کہیں مرزا تفتہ نے یہ لکھ دیا تھا کہ آپ نے بہ سبب ذوق سخن کے اصلاح اشعار منظور فرمائی تھی۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں: "لاحول ولاقوۃ! کس ملعون نے بہ سبب ذوق شعر کے اشعار کی اصلاح منظور رکھی؟ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بطریق قہر درویش بہ جان درویش لکھا تھا جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے۔ میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔"

اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل اُن کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے اندھے، لنگڑے، لولے اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپے ماہوار کی ہو گئی تھی، اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا۔ مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے۔ اکثر تنگ رہتے تھے۔ غدر کے بعد ایک بار میں نے خود دیکھا کہ نواب لفٹننٹ گورنر کے دربار میں ان کو حسب معمول سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا۔ لفٹنٹی کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا۔ اس لیے انھوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقوم جواہر بازار میں فروخت کرنے کے لیے بھیج دی تھیں۔ چپراسیوں کو الگ مکان میں بٹھا دیا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آ گئی تب ان کو انعام دے کر رخصت کیا۔

وہ اپنے ان دوستوں کے ساتھ جو گردشِ روزگار سے بگڑ گئے تھے، نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے۔ دلی کے عمائد میں سے ایک صاحب جو مرزا کے دلی دوست تھے اور غدر کے بعد ان کی حالت سقیم ہو گئی تھی، ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے مرزا سے ملنے کو آئے۔ مرزا نے کبھی ان کو مالیدہ یا جامہ دار وغیرہ کے چغوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل ان کے بدن پر دیکھ کر دل بھر آیا۔ ان سے پوچھا کہ "یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی؟ مجھے اس کی وضع بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ آپ مجھے بھی فرغل کے لیے یہ چھینٹ منگوا دیں۔" انھوں نے کہا کہ یہ فرغل آج ہی

بن کر آیا ہے اور میں نے اسی وقت اس کو پہنا ہے اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے۔ مرزا نے کہا جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں مگر جاڑا بہت شدت سے پڑ رہا ہے۔ آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائیں گے؟ پھر ادھر اُدھر دیکھ کر کھونٹی پر سے اپنا مالیدہ کا نیا چغہ اُتار کر انھیں پہنا دیا اور اس خوب صورتی کے ساتھ وہ چغہ ان کی نذر کیا۔

وہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسّی کے لٹکالوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہنچا، نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار، میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو۔ وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود دربدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔"

جیسی مرزا کی طبیعت میں ذکاوت اور ذہن میں جودت تھی اسی طرح ان کا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ان کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا۔ ہمیشہ کرائے کی کتابیں منگوا لیتے تھے اور ان کو دیکھ کر واپس بھیج دیتے تھے مگر جو لطیف یا کام کی بات کتاب میں نظر پڑ جاتی تھی، ان کے دل پر نقش ہو جاتی تھی۔ فارسی کلام میں وہ کوئی لفظ یا محاورہ یا ترکیب نہیں برتتے تھے جس کی سند اہل زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہوں۔ کلکتہ میں جن لوگوں نے ان کے کلام پر اعتراض کیے تھے اور جن کے جواب میں مرزا نے مثنوی باد مخالف لکھی تھی، ان کو مثنوی کے علاوہ ایک ایک اعتراض کے جواب میں دس دس بارہ بارہ سندیں اساتذہ کے کلام سے لکھوا کر علیحدہ بھیجی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے خطوط میں ان کو مفصل بیان کیا ہے۔ برہان قاطع پر جو کچھ انھوں نے لکھا وہ محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر لکھا۔ فکرِ شعر کا یہ طریقہ تھا کہ اکثر رات کو عالم سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے اور جب کوئی شعر سرانجام ہوتا تھا تو کمر بند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے۔ اس طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار

قلم بند کر لیتے تھے۔

شعر فہمی اور کتاب فہمی میں وہ ایک مستثنیٰ آدمی تھے۔ کیسا ہی مضمون ہو وہ اکثر ایک سرسری نظر میں اس کی تہ کو پہنچ جاتے تھے۔ نواب ممدوح نے مجھ سے ایک واقعہ بیان کیا جس سے مرزا کی سخن سنجی کا بہت بڑا ثبوت ملتا ہے۔ مولانا آزردہ نے "دور نہیں" "نور نہیں" اس زمین میں غزل لکھی تھی۔ اس میں اتفاق سے مطلع بہت اچھا نکل آیا تھا۔ مولانا نے اپنی غزل دوستوں کو سنا کر ان سے کہا کہ "اگرچہ بحر دوسری ہے مگر ردیف وقافیہ میں نظیری کی بھی ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے کہ

عشق عصیان ست اگر مستور نیست
کشتۂ جرم زباں مغفور نیست

ظاہر ہے کہ اگر نظیری ہندی نژاد ہوتا اور اسی زمین جس میں ہماری غزل ہے، اردو غزل لکھتا تو اس کا مطلع اس طرح ہوتا۔

عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں
کشتۂ جرم زباں ناجی و مغفور نہیں

آؤ آج مرزا غالب کے ہاں چلیں اور بغیر اس کے قائل کا نام لیا جائے اور اپنا مطلع اور نظیری کے مطلع کا یہی اردو ترجمہ (جو اوپر مذکور ہوا) مرزا کو سنائیں اور پوچھیں کہ کون سا مطلع اچھا ہے"۔ چونکہ نظیری کا مطلع اردو ترجمہ سے بہت پست ہو گیا تھا۔ سب کو یقین تھا کہ مرزا نظیری کے مطلع کو ناپسند کریں گے اور مولانا آزردہ کے مطلع کو ترجیح دیں گے چنانچہ مولانا اور نواب صاحب اور بعض اور احباب مرزا کے ہاں پہونچے۔ معمولی بات چیت کے بعد مولانا نے کہا کہ دو مطلعے ہیں، ان میں آپ محاکمہ کیجیے کہ کون سا مطلع اچھا ہے، اور بطور بیٹھن کے اوّل نظیری کے مطلع کا یہی ترجمہ پڑھا۔ ابھی مولانا اپنا مطلع پڑھنے نہیں پائے تھے کہ مرزا اس مطلع کو سن کر سر دھننے لگے اور متحیر ہو کر پوچھنے لگے کہ یہ مطلع کس نے لکھا؟ اور اس قدر تعریف کی کہ مولانا آزردہ کو یہ امید نہ رہی کہ اس سے زیادہ میرے مطلع کی داد ملے گی۔ چنانچہ انھوں نے اپنا مطلع نہیں پڑھا۔ اور سب لوگ نہایت تعجب کرتے ہوئے وہاں سے اُٹھے۔

مرزا حقایق اور معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے اور ان کو خوب سمجھتے تھے۔

نواب فرماتے تھے کہ میں شاہ ولی اللہ کا ایک فارسی رسالہ جو حقایق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا مطالعہ کر رہا تھا اور ایک مقام پر یہ بالکل سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اتفاقاً اسی وقت مرزا صاحب آ نکلے۔ میں نے وہ مقام مرزا کو دکھایا۔ انھوں نے کسی قدر غور کے بعد اس کا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب بھی شاید اس سے زیادہ نہ بیان کر سکتے۔

مرزا کی تقریر میں ان کی تحریر اور ان کی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا اور اسی وجہ سے لوگ ان سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے مگر جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے، حسن بیان، حاضر جوابی اور بات میں سے بات پیدا کرنا ان کی خصوصیات میں سے تھا۔

ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا تو قلعہ میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا۔ مرزا تم نے کتنے روزے رکھے؟ عرض کیا پیر و مرشد ایک نہیں رکھا۔

ایک دن نواب مصطفےٰ خاں کے مکان پر ملنے کو آئے۔ ان کے مکان کے آگے چھتہ بہت تاریک تھا۔ جب چھتے سے گزر کر دیوان خانے کے دروازے پر پہنچے تو وہاں نواب صاحب ان کے لینے کو کھڑے تھے۔ مرزا نے ان کو دیکھ کر یہ مصرع پڑھا:

کہ آب چشمۂ حیواں درون تاریکیست

جب دیوان خانے میں پہنچے تو اس دالان میں بہ سبب شرق رویہ ہونے کے دھوپ بھری ہوئی تھی۔ مرزا نے وہاں یہ مصرعہ پڑھا:

ایں خانہ تمام آفتاب ست

ایک صحبت میں مرزا میر تقی کی تعریف کر رہے تھے شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود تھے۔ انھوں نے سودا کو میر پر ترجیح دی۔ مرزا نے کہا " میں تو تم کو میری سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں۔"

مکان کے جس کمرہ میں مرزا دن بھر بیٹھتے اٹھتے تھے وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا اور اس کے ایک جانب ایک کوٹھری تنگ و تاریک تھی جس کا در اس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں جھک کر جانا پڑتا تھا، اس میں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر گرمی اور

لُو کے موسم میں دس بجے سے تین چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے۔ ایک دن جب کہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا، مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے۔ اس وقت مرزا صاحب اسی کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولانا بھی وہیں پہنچے۔ اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے کہ ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردّد پیدا ہوگیا۔ مرزا نے کہا۔ "قبلہ حدیث بالکل صحیح ہے مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری تو ہے۔"

الغرض مرزا کی کوئی بات لطف و ظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی۔ اگر کوئی ان کے تمام ملفوظات جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف و ظرائف کی تیار ہو جاتی۔

باوجودیکہ مرزا کی آمدنی اور مقدور بہت کم تھا مگر خودداری و حفظِ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ شہر کے امراء و عمائد سے برابر کی ملاقات تھی۔ کبھی بازار میں بغیر پالکی یا ہوادار کے نہیں نکلتے تھے۔ عمائدِ شہر میں سے جو لوگ ان کے مکان پر نہیں آتے تھے، وہ بھی کبھی ان کے مکان پر نہیں جاتے تھے اور جو شخص ان کے مکان پر آتا تھا وہ بھی اس کے مکان پر ضرور جاتے تھے۔ ایک روز کسی سے مل کر نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کے مکان پر آئے۔ میں بھی اس وقت وہاں موجود تھا۔ نواب صاحب نے کہا آپ مکان سے سیدھے یہیں آئے ہیں یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا؟ مرزا صاحب نے کہا مجھ کو ان کا ایک آنا دینا تھا اس لئے اول وہاں گیا تھا، وہاں سے یہاں آیا ہوں۔

ایک دن دیوان فضل اللہ خاں مرحوم چُرٹ میں سوار مرزا کے مکان کے پاس سے بغیر ملے نکل گئے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو انھوں نے ایک رُقعہ دیوان جی کو لکھا۔ مضمون یہ کہ آج مجھ کو اس قدر ندامت ہوئی کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہو سکتی ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی تو اس طرف سے گزریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں۔ جب یہ رُقعہ دیوان جی کے پاس پہنچا تو وہ نہایت شرمندہ ہوئے اور اسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔

مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے۔ یہاں تک کہ مسہل کے دن بھی انھوں نے کھچڑی یا شولہ کبھی نہیں کھایا

آخر میں ان کی خوراک بہت کم ہوگئی تھی۔ صبح کو وہ اکثر شیرۂ بادام پیتے تھے۔ دن کو جو کھانا ان کے لیے گھر میں سے آتا تھا اس میں صرف پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا۔ ایک پیالے میں بوٹیاں دوسرے میں لعاب یا شوربا، ایک پیالی میں ایک پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا، ایک پیالی میں کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی ایک اور پیالی میں دو تین پیسے بھر دہی اور شام کو کسی قدر شامی کباب یا سیخ کے کباب۔ بس اس سے زیادہ ان کی خوراک اور کچھ نہ تھی۔

ایک روز دوپہر کا کھانا آیا اور دسترخوان بچھا۔ برتن تو بہت سے تھے مگر کھانا نہایت قلیل تھا۔ مرزا نے مسکرا کر کہا اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجیے تو دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھیے تو بایزید کا۔

فواکہ میں آم ان کو بہت مرغوب تھا۔ آموں کی فصل میں ان کے دوست دُور دُور سے ان کے لیے عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے اور وہ خود اپنے بعضے دوستوں سے تقاضا کر کے آم منگواتے تھے۔

ایک روز مرحوم بہادر شاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ جن میں مرزا بھی تھے باغِ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لدے ہے تھے۔ یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسّر نہیں آسکتا تھا۔ مرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے، بادشاہ نے پوچھا "مرزا اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟" مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ "پیر و مرشد یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے:

برسرِ ہر دانہ بنوشتہ عیاں　　　　کایں فلاں ابنِ فلاں ابنِ فلاں

اس کو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔" بادشاہ مسکرائے اور اسی روز بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی۔

حکیم رضی الدین خاں جو مرزا کے نہایت دوست تھے، ان کو آم نہیں بھاتے تھے۔ ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے اور مرزا بھی وہیں موجود تھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے ہوئے گلی سے گزرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے۔ گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیا۔ حکیم صاحب نے کہا۔ "دیکھیے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔" مرزا نے کہا۔ "بے شک گدھا نہیں کھاتا۔"

مرزا کی نیت آموں سے کسی طرح سیر نہ ہوتی تھی۔ اہل شہر تحفہ بھیجتے تھے، خود بازار سے منگواتے تھے، باہر سے دور دور کا آم بطور سوغات کے آتا تھا مگر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا۔ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے اور آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں جب سب لوگ اپنی اپنی کہہ چکے تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی رائے بیان کرو۔ مرزا صاحب نے کہا۔ "بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونا چاہئیں میٹھا ہو اور بہت ہو۔" سب حاضرین ہنس پڑے۔

مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی جو مقدار انھوں نے مقرر کر لی تھی اس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں، اس کی کنجی داروغہ کے پاس رہتی تھی، اور اس کو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھ کو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا اور کنجی مجھ کو نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے اور نشے کی جھانجھ میں داروغہ کو بہت برا بھلا کہتے تھے مگر داروغہ نہایت خیر خواہ تھا ہرگز کنجی نہ دیتا تھا۔ اول تو وہ مقدار میں بہت کم پیتے تھے دوسرے اس میں دو تین حصہ گلاب ملا لیتے تھے جس سے اس کی حدت اور تیزی کم ہو جاتی تھی مگر باوجود اس قدر احتیاط اور اعتدال کے اس کافر نشے کی عادت نے آخر مرزا کی صحت کو سخت صدمہ پہنچایا، جس کی شکایت سے ان کے تمام اردو رقعات بھرے ہوئے ہیں۔

مرزا کے خاص خاص شاگرد اور دوست جن سے نہایت بے تکلفی تھی اکثر شام کو ان کے پاس جا کر بیٹھتے تھے اور مرزا سرور کے عالم میں اس وقت بہت پرلطف باتیں کیا کرتے تھے، ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے تھے اور مرزا پلنگ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ میر مہدی پاؤں دابنے لگے۔ مرزا نے کہا۔ "بھئی تو سید زادہ ہے مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے؟" انھوں نے نہ مانا اور کہا "آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اجرت دے دیجیے گا۔" مرزا نے کہا "ہاں اس کا مضائقہ نہیں۔" جب وہ پیر داب چکے، انھوں نے اجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا۔ "بھیا کیسی اجرت؟ تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمھارے پیسے دابے حساب برابر ہوا۔"

ایک دن قبل غروب آفتاب کے مرزا صاحب شام کا کھانا کھا رہے تھے۔ اور

کھانے میں صرف شامی کباب تھے۔ میں بھی وہاں موجود تھا اور ان کے سامنے بیٹھا رومال سے مکھیاں جھل رہا تھا۔ مرزا نے کہا آپ ناحق تکلیف کرتے ہیں۔ میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دوں گا۔ پھر آپ ہی نے یہ حکایت بیان کی کہ " نواب عبدالاحد خان کے دسترخواں پر ان کے مصاحبوں اور عزیزوں اور دوستوں کے لیے ہر قسم کے کھانے چُنے جاتے تھے مگر خاص ان کے لئے ہمیشہ ایک چیز تیار ہوتی تھی، وہ اس کے سوا اور کچھ نہ کھاتے تھے۔ ایک روز ان کے لیے مزعفر پکا تھا، وہی ان کے سامنے لگایا گیا۔ مصاحبوں میں ایک ڈوم بہت مُنہ لگا ہوا تھا، جو اس وقت دسترخوان پر موجود تھا۔ نواب نے اس کو کھانا دینے کے لیے خالی رکابی طلب کی۔ اس کے آنے میں دیر ہوئی، نواب کھانا کھاتے جاتے تھے اور خالی رکابی بار بار مانگتے تھے۔ وہ مصاحب نواب کے آگے رومال ہلانے لگا اور کہا " حضور اور رکابی کیا کیجیے گا۔ اب یہی خالی ہوئی جاتی ہے۔" نواب یہ فقرہ سن کر پھڑک گئے اور وہی رکابی اس کی طرف سرکا دی۔

ایک دفعہ رات کو پلنگ پر لیٹے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تاروں کی ظاہری بے نظمی اور انتشار دیکھ کر بولے۔ " جو کام خود رائی سے کیا جاتا ہے، اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے ستاروں کو دیکھو کس ابتری سے بکھرے ہوئے ہیں نہ تناسب ہے نہ انتظام ہے نہ بیل ہے نہ بوٹا ہے مگر بادشاہ خود مختار ہے کوئی دم نہیں مار سکتا۔"

ایک دن سیّد سردار مرزا مرحوم شام کو چلے آئے، جب تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ واپس جانے لگے تو مرزا خود اپنے ہاتھ میں شمعدان لے کر کھسکتے ہوئے لبِ فرش تک آئے تاکہ روشنی میں جوتا دیکھ کر پہن لیں۔ انھوں نے کہا " قبلہ و کعبہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؟ میں اپنا جوتا آپ پہن لیتا۔" مرزا نے کہا۔" میں آپ کا جوتا دکھانے کو شمعدان نہیں لایا بلکہ اس لئے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں۔"

اگرچہ شاعر کی حیثیت سے انھوں نے شراب کی جا بجا تعریف کی ہے مگر اعتقاداً وہ اس کو بہت بُرا جانتے تھے اور اپنے فعل پر سخت نادم تھے۔ باوجود اس کے انھوں نے کبھی اپنے اس فعل کو چھپایا نہیں۔

شراب کے متعلق ان کی ظرافت آمیز باتیں بہت مشہور ہیں۔ ایک شخص نے ان کے سامنے شراب کی نہایت مذمت کی اور کہا کہ شراب خوار کی دُعا قبول نہیں ہوتی۔ مرزا نے کہا " بھائی جس کو شراب میسر ہے اس کو اور کیا چاہیے جس کے لیے دعا مانگے۔"

ایک خط کو اس طرح شروع کرتے ہیں :

"میر مہدی! صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے، انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے، دو حرف لکھتا ہوں ہاتھ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی مگر وہ آتشِ سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہو گیا۔ دماغ روشن ہو گیا۔ نفسِ ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقیِ کوثر کا بندہ اور تشنہ لب۔ ہائے غضب، ہائے غضب۔"

یہ خط غدر کے بعد اس زمانے میں لکھا ہے جب پنشن وغیرہ سب بند تھی اور بسبب عسرت و تنگدستی کے کچھ پیتے نہیں تھے۔

شبلی نعمانی

سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر

سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں اگرچہ رفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے۔ لیکن جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرے سے آفتاب بن گئیں، ان میں ایک اُردو لٹریچر بھی ہے۔ سرسید ہی کی بدولت اُردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر، وسعت و جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کے استاد یعنی فارسی زبان کو آج تک یہ بات نصیب نہیں۔ ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے مخصوص دائرۂ مضمون کے حکمراں ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بارِ احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو، بعض بالکل اُن کے دامنِ تربیت میں پلے ہیں۔ بعضوں نے دُور سے فیض اٹھایا ہے، بعض نے مدعیانہ اپنا الگ رستہ نکالا۔ تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے تھے۔

سرسید کی جس زمانے میں نشو و نما ہوئی دلّی میں اہلِ کمال کا مجمع تھا اور امرا، اور رؤسا سے لے کر ادنیٰ طبقے تک میں علمی مذاق پھیلا ہوا تھا۔ سرسید جس سوسائٹی کے ممبر تھے اس کے بڑے ارکان مفتی صدر الدین خاں آزردہ، مرزا غالبؔ اور مولانا صہبائی تھے۔ ان میں سے ہر شخص تصنیف و تالیف کا مالک تھا اور انھیں بزرگوں کی صحبت کا اثر تھا کہ سرسید نے ابتدا ہی میں جو مشغلۂ علمی اختیار کیا وہ تصنیف و تالیف کا مشغلہ تھا۔

اوّل وہ رواجِ عام کے اقتضا سے شاعری کے میدان میں آئے، آہیؔ تخلص اختیار کیا۔ اور اُردو میں ایک چھوٹی سی مثنوی لکھی جس کا ایک مصرع انھیں کی زبانی سنا ہوا مجھے یاد ہے۔ ع

نام میرا تھا کام ان کا تھا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کو شاعری سے مناسبت نہ تھی اس لیے وہ بہت جلد اس

کوچے سے نکل آئے، اور نثر کی طرف توجہ کی، چونکہ حقایق اور واقعات کی طرف ابتدا سے میلان تھا، اس لئے دلّی کی عمارتوں اور یادگار کی تحقیقات شروع کی اور نہایت محنت و کوشش سے اس کام کو انجام دے کر ۱۸۴۷ء میں ایک مبسوط کتاب لکھی، جو آثار الصنادید کے نام سے مشہور ہے۔

اس وقت اگرچہ سرسید کے سامنے اُردو نثر کے بعض بعض عمدہ نمونے موجود تھے، خصوصاً میرامّن صاحب کی "چہار درویش"، جو ۱۸۰۲ء میں تالیف ہوئی تھی اور جس کی سادگی، صفائی اور واقعہ طرازی آج بھی موجودہ تصانیف کی ہمسری کا دعویٰ کرسکتی ہے۔ اس کے ساتھ مضمون جو اختیار کیا گیا تھا یعنی عمارات اور ابنیہ کی تاریخ وہ تکلف اور آورد سے اِبا کرتا تھا، تاہم آثار الصنادید میں اکثر جگہ بیدل اور ظہوری کا رنگ نظر آتا ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ سرسید کی رات دن کی صحبت مولانا امام بخش صہبائی سے رہتی تھی، اور مولانائے موصوف بیدل کے ایسے دلدادہ تھے کہ ان کا کلمہ پڑھتے تھے اور جو کچھ لکھتے تھے اسی طرز میں لکھتے تھے۔

سرسید نے مجھ سے خود بیان کیا کہ آثار الصنادید کے بعض بعض مقامات بالکل مولانا امام بخش صہبائی کے لکھے ہوئے ہیں جو انھوں نے میری طرف سے اور میرے نام سے لکھ دیے تھے۔

بہر حال اس کتاب میں جہاں جہاں انشا پردازی کا زور دکھایا ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے:

> "ان حضرات کی طبع رسا شکل رابع سے پہلے اس سے نتیجہ حاصل کرتی ہے کہ بدیہی الانتاج سے ارباب فہم و ذکا اور ناخنِ فکر عقدۂ لاینحل کو پہلے اس سے واکرتا ہے کہ گرہ حباب کو انگشتِ موجِ دریا معنی فہمی اس درجہ کہ راست و درست سمجھ لیا کہ زبانِ سوسن نے کیا کہا اور رمز شناسی اس مرتبہ کہ واقعی معلوم ہوگیا کہ نگاہِ نرگس نے اشارہ کیا، اگر ان کی رائے روشن معجز نما ہو تو نقطہ موہوم کو انگشت سے تقسیم کرے اور جزو لایتجزیٰ کو دو نیم۔"

اگرچہ اس سے بہت پہلے یعنی ۱۸۳۶ء میں مولوی محمد حسین آزاد کے والد بزرگوار محمد باقر نے "اُردو اخبار" کے نام سے اردو کا پرچہ نکالا تھا اور خود سرسید نے ایک پرچہ جاری کیا جس کا نام "سید الاخبار" تھا اور دونوں پرچوں کی زبان ضرورت کے اقتضا سے سادہ اور صاف ہوتی تھی، تاہم اس وقت تک یہ زبان علمی نہیں مانی جاتی تھی، اس لیے جب کوئی شخص علمی حیثیت سے کچھ لکھتا تھا تو اسی فارسی نما طرز میں لکھتا تھا۔ سرسید نے بھی اسی وجہ سے آثار الصنادید میں جہاں

انشاپردازی سے کام لیا اسی طرز کو برتا۔

آثار الصنادید جس زمانے میں نکلی اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد تقریباً ۱۸۵۰ء میں دلّی کے مشہور شاعر مرزا غالب نے اُردو کی طرف توجہ کی۔ یعنی مکاتیب وغیرہ اُردو میں لکھنے شروع کیے اور چونکہ وہ جس طرف متوجہ ہوتے تھے اپنا کوچہ الگ نکال کر رہتے تھے، اس لیے اُنھوں نے تمام ہم عصروں کے برخلاف مکاتبہ کو مکالمہ کر دیا۔ مکاتبات میں وہ بالکل اس طرح ادائے مطلب کرتے تھے جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ بہت سے خطوط میں انسانی جذبات مثلاً رنج و غم، مسرت و خوشی، حسرت و بیکسی کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے اکثر جگہ واقعات کو اس بے ساختگی سے ظاہر کیا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہیں کہ اُردو انشاپردازی کا آج جو انداز ہے اور جس کے مجدّد اور امام سرسید مرحوم تھے۔ اس کا سنگ بنیاد دراصل مرزا غالب نے رکھا تھا۔

سرسید کو مرزا سے جو تعلق تھا وہ ظاہر ہے۔ اس لئے کچھ شبہہ نہیں ہو سکتا کہ سرسید ضرور مرزا کی طرز سے مستفید ہوئے۔

اسی زمانے میں ہندوستان کے ہر حصّے میں کثرت سے اُردو اخبارات جاری ہو گئے اور اُردو انشاپردازی کو روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ اخبارات کو ہر قسم کے اخلاقی، تمدنی، ملکی، مذہبی، تاریخی مسائل سے کام پڑتا تھا اس لیے ہر قسم کے مضامین لکھے گئے۔ تاہم انشاپردازی کا کوئی خاص اسٹائل متعین نہیں ہوا تھا اس کے علاوہ جو کچھ تھا ابتدائی حالت میں تھا۔

۱۲۸۷ھ میں جس کو آج کم و بیش ۲۷ برس ہوئے۔ سرسید نے قوم کی حالت کی اصلاح کے لیے "تہذیب الاخلاق" کا پرچہ نکالا اور اُردو انشاپردازی کو اس رتبے پر پہنچا دیا، جس کے آگے اب ایک قدم بڑھنا بھی ممکن نہیں۔ سرسید نے اُردو میں جو باتیں کیں اس کو وہ مختصراً "تہذیب الاخلاق" میں خود ایک مقام پر لکھتے ہیں۔ ان کی خاص عبارت یہ ہے:

> "جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا، رنگین عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے، اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے، اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو

مضمون کے ادا میں ہو، جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔"

اس آرٹیکل میں سرسیّد نے انشا پردازی کے اور بہت سے اُصول بتائے ہیں جن کو اس موقع پر ہم اختصار کی وجہ سے قلم انداز کرتے ہیں۔

سرسیّد کی انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مختلف مضامین پر کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ لکھا ہے اور جس مضمون کو لکھا ہے اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ اس سے بڑھ کر ناممکن ہے، فارسی اور اُردو میں بڑے بڑے شعرا اور نثار گزرے ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو تمام قسم کے مضامین کا حق ادا کر سکتا۔

فردوسی بزم میں رہ جاتا ہے۔ سعدی رزم کے مردِ میدان نہیں۔ نظامی رزم بزم دونوں کے استاد ہیں لیکن اخلاق کے کوچہ سے آشنا نہیں، ظہوری صرف مدحیہ نثر لکھ سکتا ہے، برخلاف اس کے سرسیّد نے اخلاق، معاشرت، پالیٹکس، مناظرِ قدرت وغیرہ سب پر لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے لاجواب لکھا ہے۔ مثال کے طور پر بعض بعض مضامین کے جستہ جستہ فقرے نقل کرتے ہیں، اُمید کی خوشی پر ایک مضمون لکھا ہے، جس میں امید کو مخاطب کیا ہے، اس کے چند فقرے یہ ہیں:

دیکھ نادان بے بس بچّہ گہوارے میں سوتا ہے، اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے اور اس گہوارے کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے۔ ہاتھ کام میں اور دل بچے میں ہے اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے "سو رہ میرے بچے سو رہ، اے اپنے باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک سو رہ، اے میرے دل کی کونپل سو رہ، بڑھ اور پھل پھول، تجھ پر کبھی خزاں نہ آئے، تیری ٹہنی میں کبھی کوئی خار نہ پھوٹے، کوئی کٹھن گھڑی تجھ کو نہ آئے۔ سو رہ میرے بچے سو رہ، میری آنکھوں کے نور اور میرے دل کے سرور، میرے بچے سو رہ، تیری شہرت، تیری لیاقت، تیری محبت جو تو ہم سے کرے گا، ہمارے دل کو تسلی دیں گی، سو رہ میرے بچّے سو رہ، میرے بالے سو رہ۔"

یہ اُمید کی خوشیاں ماں کو اس وقت تھیں جبکہ بچّہ غوں غاں بھی نہیں کر سکتا تھا مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا اور معصوم ہنسی سے ماں کے دل کو شاد کرنے لگا، اور

اماں اماں کہنا سیکھا۔ اس کی پیاری آواز ادھورے لفظوں میں اس کی ماں کے کان میں پہنچنے لگی۔ آنسوؤں سے اپنی ماں کی آتش محبت کے بھڑکانے کے قابل ہوا، پھر مکتب سے اس کو سروکار پڑا۔ رات کو ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق غمزدہ دل سے سنانے لگا اور جب کہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر منہ ہاتھ دھوکر اپنے باپ ماں کے ساتھ صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا اور اپنے بےگناہ دل، بےگناہ زبان سے، بےریا خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا تو امید کی خوشیاں اور کس قدر زیادہ ہوگئیں۔ آہ! ہماری پیاری امید تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ ہے۔

وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے۔ کوچ پر کوچ کرتے تھک گیا ہے، لڑائی کے میدان میں جب کہ بہادروں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں اور لڑائی کا میدان ایک سنسان کا عالم ہوتا ہے۔ دلوں میں عجیب قسم کی خوف ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے اور جب کہ لڑائی کا وقت آتا ہے اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بےخوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے اور جب کہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں اور بادل سی کڑکنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے اور جب کہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے، تو اے بہادروں کی قوت بازو! اور اے بہادروں کی ماں! تیرے ہی سبب سے فتح مندی کا خیال اس کے دل کو تقویت دیتا ہے، اس کا کان نقارے میں سے تیرے ہی نغمے کی آواز سنتا ہے۔

تم دیکھ سکتے ہو کہ ان چند سطروں میں کس طرح نیچر کی تصویر کھینچی ہے اور اس میں کس قدر درد اور اثر پیدا کیا ہے۔

پالٹیکس کا راستہ اس سے بالکل الگ ہے۔

پنجاب میں جب یونیورسٹی قائم ہو رہی تھی جس میں اورنٹیل تعلیم پر بہت زور دیا گیا تھا تو سرسید کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس سے پالٹیکس کی بنا پر ہم کو اعلیٰ تعلیم سے روکنا مقصود ہے۔ اس وقت سرسید نے پے درپے تین آرٹیکل لکھے۔ ان آرٹیکلوں نے یونیورسٹی کے بانیوں کو اس قدر گھبرا دیا کہ خاص

ان آرٹیکلوں کے جواب میں سیکڑوں مضامین لکھے گئے اور ان کا مجموعہ یکجا کر کے ایک مستقل کتاب تیار کی، افسوس ہے کہ اختصار کی وجہ سے ہم ان آرٹیکلوں کا کوئی حصہ نقل نہیں کر سکتے۔

سرسید نے انشاپردازی کی ترقی کے جو طریقے ایجاد کیے ان میں ایک یہ تھا کہ بہت سے اعلیٰ درجے کے انگریزی مضامین کو اردو زبان کا قالب پہنایا لیکن ترجمے کے ذریعے سے نہیں، کیونکہ یہ طریقہ اب تک بے سود ثابت ہوا ہے بلکہ اس طرح کہ انگریزی خیالات اُردو میں، اُردو کی خصوصیات کے ساتھ ادا کیے۔ امید کی خوشی کا مضمون جس کے ہم نے بعض فقرات اوپر نقل کیے دراصل ایک انگریزی مضمون سے ماخوذ ہے۔ انگریزی میں اڈیسن اور اسٹیل بڑے مضمون نگار گزرے ہیں، سرسید نے ان کے متعدد مضامین کو اپنی زبان میں ادا کیا ہے۔

سرسید کی انشاپردازی کا بڑا کمال اس موقع پر معلوم ہوتا ہے جب وہ کسی علمی مسئلے پر بحث کرتے ہیں۔ اُردو زبان چونکہ کبھی علمی زبان کی حیثیت سے کام میں نہیں لائی گئی، اس میں علمی اصطلاحات، علمی الفاظ اور علمی تلمیحات بہت کم ہیں۔ اس لئے اگر کسی علمی مسئلے کو اردو میں لکھنا چاہو تو الفاظ مساعدت نہیں کرتے۔ لیکن سرسید نے مشکل سے مشکل مسائل کو اس وضاحت، صفائی اور دل آویزی سے ادا کیا ہے کہ پڑھنے والا جانتا ہے کہ وہ کوئی دلچسپ قصہ پڑھ رہا ہے۔

پروفیسر رینان نے جو فرانس کا ایک بڑا مشہور مصنف گزرا ہے، اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ "عربی زبان میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ فلسفیانہ مسائل کو ادا کر سکے"۔

رینان جن مسائل کے ادا کرنے کے لیے عربی زبان کو ناقابل سمجھتا ہے (گو یہ اس کا خیال محض غلط ہے) سرسید نے اردو جیسی کم مایہ زبان میں وہ مسائل ادا کر دیے ہیں۔

سرسید نے فلسفۂ الٰہیات پر جو کچھ اپنی مختلف تحریروں میں لکھا ہے، وہ فلسفہ کے اعلیٰ درجے کے مسائل ہیں۔

زمانہ جانتا ہے کہ مجھ کو سرسید کے مذہبی مسائل سے سخت اختلاف تھا اور میں اُن کے بہت سے عقاید و خیالات کو بالکل غلط سمجھتا تھا، تاہم اس سے مجھ کو کبھی انکار نہ ہو سکا کہ ان مسائل کو سرسیدؔ نے جس طرح اردو زبان میں ادا کیا کوئی اور شخص کبھی ادا نہیں کر سکتا۔

سرسید کی تحریروں میں جابجا ظرافت اور شوخی بھی ہوتی ہے لیکن نہایت تہذیب اور لطافت کے ساتھ مولوی علی بخش خاں صاحب مرحوم جو سرسید کے رد میں رسالے لکھا کرتے تھے۔ حرمین شریفین گئے اور وہاں سے سرسید کی تکفیر کا فتویٰ لائے۔ اس پر سرسید ایک موقع پر تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں:

"جو صاحب ہماری تکفیر کے فتوے لینے کو مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے اور ہمارے کفر کی بدولت ان کو حج اکبر نصیب ہوا، ان کے لائے فتووں کے دیکھنے کے ہم بھی مشتاق ہیں سبحان اللہ ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے کہ کسی کو حاجی اور کسی کو ہاجی اور کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بناتا ہے۔

یاراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست — در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس"

تہذیب الاخلاق جب بند ہوا ہے تو سرسید نے خاتمے پر جو مضمون لکھا ہے، اس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں:

"سوتوں کو جھنجھوڑتے ہیں کہ جاگ اٹھیں، اگر اٹھ کھڑے ہوئے تو مطلب پورا ہو گیا اور اگر نیند میں اٹھانے سے کچھ بڑبڑائے کچھ جھنجلائے ادھر ہاتھ جھٹک دیا، ادھر پیر پٹک دیا اور اینڈے پڑے سوتے رہے تو بھی توقع ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد جاگ اٹھیں گے۔ شاید ہمارے بھائیوں کی اس اخیر درجے تک نوبت آگئی ہے، اگر یہ خیال ٹھیک ہو تو ہم کو بھی زیادہ نہ چھیڑنا چاہیے۔ بچے اٹھاتے وقت کہا کرتے ہیں کہ ہم کو اٹھائے جاؤ گے تو ہم اور پڑے رہیں گے۔ تم ٹھہر جاؤ، ہم آپ ہی اٹھ کھڑے ہوں گے۔ بچہ کڑوی دوا پیتے وقت منہ بسور کر ماں سے کہتا ہے کہ بی، یہ مت کہے جاؤ کہ شاباش بیٹا پی لے، پی لے، تم چپ رہو، میں آپ ہی پی لوں گا۔ لو بھائیو! اب ہم کبھی نہیں کہتے کہ "اٹھو اٹھو پی لو۔"

حقیقت یہ ہے کہ سرسید نے اردو انشا پردازی پر جو اثر ڈالا ہے اس کی تفصیل کے لیے دو چار صفحے کافی نہیں ہو سکتے۔ یہ کام درحقیقت مولانا حالی کا ہے۔ وہ لکھیں گے اور خوب لکھیں گے۔ یہ کہنا چاہیے کہ لکھ چکے ہیں اور خوب لکھا ہو گا۔ میں کالج کی طرف سے مجبور کیا گیا تھا کہ اس وقت جب تمام ملک میں سرسید کا آوازہ ماتم گونج رہا ہے اور ہر شخص ان کے کارناموں کے سننے کا شائق ہے کچھ نہ کچھ مختصر طور پر فوراً لکھنا چاہیے۔ میں نے اسی کی تعمیل کی۔ ورنہ میں مولانا حالی کی مقبوضہ سرزمین میں مداخلت کا کوئی حق نہیں رکھتا۔

سرسید

امید کی خوشی

اے آسمان پر بھورے بادلوں میں بجلی کی طرح چمکنے والی دھنک! اے آسمان کے تارو، تمھاری خوش نما چمک! اے بلند پہاڑوں کی آسمان سے باتیں کرنے والی دھندلی چوٹیو! اے پہاڑ کے عالی شان درختو! اے اونچے اونچے ٹیلوں کے دل کش بیل بوٹو! تم بہ نسبت ہمارے پاس کے درختوں اور سرسبز کھیتوں اور لہراتی ہوئی نہروں کے کیوں زیادہ خوش نما معلوم ہوتے ہو؟ اس لیے کہ ہم سے بہت دور ہو، اس دوری ہی نے تم کو یہ خوبصورتی بخشی ہے۔ اس وجہ ہی سے تمھارا نیلا رنگ ہماری آنکھ کو بھایا ہے تو ہماری زندگی میں بھی جو چیز بہت دور ہے، وہی ہم کو زیادہ خوش کرنے والی ہے۔

وہ چیز کیا ہے؟ کیا عقل ہے جس کو سب، سب سے اعلیٰ سمجھتے ہیں؟ کیا وہ ہم کو آیندہ کی خوشی کا یقین دلا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں! اس کا میدان تو نہایت تنگ ہے۔ بڑی دوڑ دھوپ کرے تو نیچر تک اس کی رسائی ہے، جو سب کے سامنے ہے۔

او نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی بیٹی امید! یہ خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے۔ تو ہی ہماری مصیبت کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے؛ تو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے؛ تیری ہی بدولت نہایت دور دراز خوشیاں، ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے سے زندگی کی مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں؛ تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں؛ تیری ہی برکت سے خوشی، خوشی کے لیے نام آوری، نام آوری کے لیے بہادری، بہادری کے لیے فیاضی، فیاضی کے لیے محبت، محبت کے لیے نیکی، تیار ہے! انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع اور تیری ہی فرماں بردار ہیں۔

وہ پہلا گنہگار انسان جب شیطان کے جنگل میں پھنسا، اور تمام نیکیوں نے اس کو چھوڑا اور تمام بدیوں نے اس کو گھیرا، تو صرف تو ہی اس کے ساتھ رہی؛ تو ہی نے اس نا اُمید کو

ناامید نہیں ہونے دیا ؛ تو ہی نے اس موت میں پھنسے ہوئے دل کو مرنے نہیں دیا؛ تو ہی نے اسکو ذلت سے نکالا، اور پھر اس کو اعلیٰ درجے پر پہنچایا، جہاں کہ فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا۔

اس نیک نبی کو جس نے سیکڑوں برس اپنی قوم کے ہاتھ سے مصیبت اٹھائی اور مار پیٹ سہی، تیرا ہی خوبصورت چہرہ تسلی دینے والا تھا (وہ پہلا ناخدا، جبکہ طوفان کی موجوں میں بہا جاتا تھا اور بجز مایوسی کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا تو ہی اس طوفان میں اس کی کشتی کھینے والی اور اس کا بیڑا پار لگانے والی تھی۔ تیرے ہی نام سے جودی پہاڑ کی مبارک چوٹی کو عزت ہے۔ زیتون کی ہری ٹہنی کو جو وفادار کبوتر کی چونچ میں وصل کے پیغام کی طرح پہونچی، جو کچھ برکت ہے تیری ہی بدولت ہے۔

اے آسمانوں کی روشنی! اور اے ناامید دلوں کی تسلی امید! تیرے ہی شاداب اور سرسبز باغ سے ہر ایک محنت کا پھل پاتا ہے۔ تیرے ہی پاس ہر درد کی دوا ہے۔ تجھی سے ہر ایک رنج میں آسودگی ہے۔ عقل کے ویران جنگلوں میں بھٹکتے بھٹکتے تھکا ہوا مسافر تیرے ہی گھنے باغ کے سرسبز درختوں کے سائے کو ڈھونڈھتا ہے، وہاں کی ٹھنڈی ہوا، خوش الحان جانوروں کے راگ، بہتی نہروں کی لہریں اس کے دل کو راحت دیتی ہیں، اس کے مرے ہوئے خیالات کو پھر زندہ کرتی ہیں۔ تمام فکریں دل سے دور ہوتی ہیں، اور دور دراز زمانے کی خیالی خوشیاں سب آموجود ہوتی ہیں۔

دیکھ! نادان بے کس بچہ گہوارے میں سوتا ہے، اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے اور اس گہوارے کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے۔ ہاتھ کام میں اور دل بچے میں ہے اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے۔

سورہ! میرے بچے سورہ!! اے اپنے باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک سورہ! اے میرے دل کی کونپل سورہ! بڑھ! اور پھل پھول! تجھ پر کبھی خزاں نہ آنے پائے! تیری ٹہنی میں کوئی خار کبھی نہ پھوٹے! کوئی کٹھن گھڑی تجھ کو نہ آوے! کوئی مصیبت جو تیرے ماں باپ نے بھگتی تو نہ دیکھے! سورہ! میرے بچے سورہ! میری آنکھوں کے نور اور میرے دل کے سرور سورہ! تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا! تیری خصلت تیرے باپ سے بھی زیادہ اچھی ہوگی۔ تیری شہرت، تیری لیاقت، تیری محبت جو تو ہم سے کرے گا، آخر کار ہمارے دل کو تسلی دیں گی! تیری ہنسی ہمارے اندھیرے گھر کا اجالا ہوگی! تیری پیاری پیاری باتیں ہمارے

غم کو دور کریں گی! تیری آواز ہمارے لیے خوش آیند راگنیاں ہوں گی! سورہ میرے بچے! سورہ! اے ہماری امیدوں کے پودے، سورہ! بولو! جب اس دنیا میں ہم تم سے جدا ہو جائیں گے تو تم کیا کروگے؟ تم ہماری بے جان لاش کے پاس کھڑے ہوگے! تم پوچھوگے اور ہم کچھ نہ بولیں گے! تم روؤگے اور ہم کچھ رحم نہ کریں گے! اے میرے پیارے رونے والے! تم ہمارے ڈھیر پر آکر، ہماری رُوح کو خوش کروگے، آہ! ہم نہ ہوں گے اور تم ہماری یادگاری میں آنسو بہاؤگے! اپنی ماں کا محبت بھرا چہرہ، اپنے باپ کی نورانی صورت یاد کروگے! آہ! ہم کو یہی رنج ہے کہ اس وقت ہماری محبت یاد کرکر تم رنجیدہ ہوگے! سورہ! میرے بچے! سورہ! سورہ! میرے بالے! سورہ!!

یہ امیدوں کی خوشیاں ماں کو اس وقت تھیں جبکہ بچّہ غوں غاں بھی نہیں کر سکتا تھا مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا اور معصوم ہنسی سے اپنی ماں کے دل کو شاد کرنے لگا اور "اماں! اماں" کہنا سیکھا، اس کی پیاری آواز ادھورے لفظوں میں اس کے ماں کے کان میں پہنچنے لگی۔ آنسوؤں سے اپنی ماں کے آتش محبت کو بھڑکانے کے قابل ہوا، پھر مکتب سے سروکار پڑا۔ رات کو اپنی ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق غمزدہ دل سے سُنانے لگا، اور جبکہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اُٹھ کر ہاتھ منہ دھو کر اپنے ماں باپ کے ساتھ نماز میں کھڑا ہونے لگا، اور اپنے بے گناہ دل، بے گناہ زبان سے، بے ریا خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا، تو امید کی خوشیاں اور کس قدر زیادہ ہو گئیں۔ اس کے ماں باپ اس معصوم سینے سے سچی ہمدردی دیکھ کر کتنے خوش ہوتے ہیں! او ہماری پیاری امید! تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ رہتی ہے۔

دیکھو! وہ بڈھا، آنکھوں سے اندھا، اپنے گھر میں بیٹھا روتا ہے، اس کا پیارا بیٹا بھیڑوں کے ریوڑ میں سے غائب ہو گیا ہے۔ وہ اس کو ڈھونڈھتا ہے، پر وہ نہیں ملتا؛ مایوس ہے، پر اُمید نہیں ٹوٹی؛ لہو بھرا، دانتوں بھٹا کرتا دیکھتا ہے، پر ملنے سے ناامید نہیں؛ فاقوں سے خشک ہے، غم سے زار و نزار ہے، روتے روتے آنکھیں سفید ہو گئی ہیں، کوئی خوشی اس کے ساتھ نہیں ہے مگر صرف ایک اُمید ہے جس نے اس کو وصل کی امید میں زندہ، اور اس کے خیال میں خوش رکھا ہے۔

دیکھو! وہ بے گناہ قیدی، اندھیرے کنوئیں میں، سات تہ خانوں میں بند ہے، اس کا سورج سا چمکنے والا چہرہ زرد ہے۔ بے یار و دیار غیر قوم، غیر مذہب کے لوگوں کے ہاتھ میں قید

ہے، بڈھے باپ کا غم اس کی روح کو صدمہ پہنچاتا ہے۔ عزیز بھائی کی جدائی اس کے دل کو غمگین رکھتی ہے، قید خانے کی مصیبت اس کی تنہائی، اس گھر کا اندھیرا، اور اس پر اپنی بے گناہی کا خیال، اس کو نہایت ہی رنجیدہ رکھتا ہے۔ اس وقت اس کا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ مگر اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید! تجھی میں اس کی خوشی ہے۔

وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے، کوچ پر کوچ کرتے تھک گیا ہے، ہزاروں خطرے درپیش ہیں، مگر سب میں تقویت تجھی سے ہے۔ لڑائی کے میدان میں جبکہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں اور لڑائی کا میدان ایک سنسان کا عالم ہوتا ہے دلوں میں عجیب خوف ملی ہوئی حرکت ہوتی ہے؛ اور جبکہ لڑائی کا وقت آتا ہے اور لڑائی کے بگل کی آواز بہادر سپاہی کے کان میں پہونچتی ہے، اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے، اور جبکہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں، اور بادل کی سی کڑکنے والی، اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے، اور جبکہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا، زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے، تو اے بہادروں کی قوت بازو، اور اے بہادری کی ماں! تیرے ہی سبب سے فتح مندی کا خیال اس کے دل کو تقویت دیتا ہے، اس کا کان نقارے میں سے تیرے ہی نغمے کی آواز سنتا ہے۔

وہ قومی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے۔ دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے، ہر وقت بھلائی کی تدبیریں ڈھونڈھتا ہے۔ ان کی تلاش میں دور دراز کا سفر اختیار کرتا ہے، یگانوں بیگانوں سے ملتا ہے۔ ہر ایک کی بول چال میں اپنا مطلب ڈھونڈھتا ہے مشکل کے وقت ایک بڑی مایوسی سے مدد مانگتا ہے، جن کی بھلائی چاہتا ہے، انھیں کو دشمن پاتا ہے۔ شہری وحشی بتاتے ہیں۔ دوست آشنا دیوانہ کہتے ہیں۔ عالم فاضل کفر کے فتووں کا ڈر دکھاتے ہیں۔ بھائی بند، عزیز، اقارب سمجھاتے ہیں اور پھر یہ شعر پڑھ کر چپ ہو رہتے ہیں ؎

بھائی سید تو کچھ دیوانے ہیں — وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں

ساتھی ساتھ دیتے ہیں، مگر ہاں ہاں کر کر، محنت اور دل سوزی سے دور رہ کر۔ بہت سی ہمدردی کرتے ہیں، پر کوٹھی کھٹلے سے الگ کر کر، دل ہر وقت بے قرار ہے کسی کو اپنا سا نہیں پاتا، کسی پر دل نہیں ٹھہرتا۔ مگر اے بے قرار دلوں کی راحت، اور اے شکستہ خاطروں کی تقویت! تو ہی ہر دم ہمارے ساتھ ہے، تو ہی ہمارے دل کی تسلی ہے، تو ہی ہماری کٹھن منزلوں کی ساتھی ہے، تیری ہی

تقویت سے ہم اپنی منزلِ مقصود تک پہونچیں گے۔ تیرے ہی سبب گوہرِ مراد کو پاویں گے، اور ہمارے دل کی عزیز اور ہمارے پیارے "مہدی" کی پیاری امید! تو ہمیشہ ہمارے دل کی تسلی رہ۔

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید! جبکہ زندگانی کا چراغ ٹمٹماتا ہے اور دنیاوی حیات کا آفتاب لبِ بام ہوتا ہے؛ ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی، رنگ فق ہو جاتا ہے، منہ پر مردنی چھا جاتی ہے؛ ہوا، ہوائیں؛ پانی، پانی میں؛ مٹی، مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے، تو تیرے ہی سہارے سے وہ کٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے۔ اس وقت زرد چہرے، اور آہستہ آہستہ ہلتے ہوئے ہونٹوں اور بے خیال بند ہوتی ہوئی آنکھوں، اور غفلت کے دریا میں ڈوبتے ہوئے دل کو تیری یادگاری ہوتی ہے، تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ تیری صدا کان میں آتی ہے، اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے، اور ایک نئی لازوال زندگی کی، جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی، امید ہوتی ہے۔

یہ تکلیف کا وقت تیرے سبب سے ہمارے لیے موسم بہار کی آمد آمد کا زمانہ ہو جاتا ہے۔ اس کی لازوال آنے والی خوشی کی امید، تمام دنیاوی رنجوں اور جسمانی تکلیفوں کو بھلا دیتی ہے اور غم کی شام کو، صبح کی خوشی سے تبدیل کر دیتی ہے؛ گو کہ موت ہر دم جتاتی رہتی ہے، کہ مرنا بہت خوفناک چیز ہے۔

ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی دوسری دنیا میں، جس میں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے جہاں سورج کی کرن اور زمانے کی لہر بھی نہیں، تیری راہ تین چیزوں سے طے ہوتی ہے، ایمان کے توشے، اور امید کے ہادی، اور موت کی سواری سے۔ مگر ان سب میں جس کو سب سے زیادہ قوت ہے وہ ایمان کی خوبصورت بیٹی ہے، جس کا پیارا نام اُمید ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ بے یقینوں کی موت کی کٹھن گھڑی میں کچھ اُمید نہیں ہوتی مگر میں دیکھتا ہوں کہ تیری بادشاہت وہاں بھی ہے۔ قیامت پر یقین نہ کرنے والا سمجھتا ہے کہ تمام زندگی کی تکلیفوں کا اب خاتمہ ہے اور پھر کسی تکلیف کے ہونے کی توقع نہیں ہے۔

نذیر احمد

خود غرض دوست

مرزا کی ظاہرداری نے اس کو اس قدر دھوکا دے رکھا تھا کہ ان کو ماں باپ بھائی بہن، خویش واقارب سب سے بڑھ کر اپنا خیر خواہ، سب سے زیادہ اپنا دوست سمجھتا تھا۔ اور بے امتحان بے آزمایش اس کو مرزا پر تکیہ و اعتماد تھا کہ اتنا شاید دانش مند آدمی کو متواتر تجربوں کے بعد بھی کسی دوست پر نہیں ہو سکتا۔ بات اصل یہ ہے کہ مردم شناسی کی جو ایک صفت ہے۔ کلیم میں مطلق نہ تھی۔ مرزا سے زیادہ اپنی نسبت مغالط تھا، اور اس نے اپنے تئیں ایسا عزیز الوجود فرض کر رکھا تھا کہ ایک سے ایک لایق نوکری کی جستجو میں مارے مارے پھرتے ہیں اور نہیں ملتی اور کلیم کے ذہن میں از خود یہ خنّاس سمایا ہوا تھا کہ گویا تمام ہندوستانی سرکاریں اس کے قدوم میمنت لزوم کی متمنی اور منتظر ہیں اور جس طرف کو چل کھڑا ہوگا وہاں کا والی ملک اس کی تشریف آوری کو بس غنیمت سمجھے گا۔ گھر سے نکلا تو محض تہی دست لیکن اس خیال میں مگن کہ اب کوئی دم جاتا ہے مالک خزاین الارض بننے والا ہوں۔ چلا جوتیاں چٹخاتا ہوا مگر اس تصوّر میں مست کہ فیل کوہ پیکر مع ہودج زر اس کی سواری کے لیے آرہا ہے باوجودیکہ شب خوابی کے کپڑوں کے سوائے بدن پر کچھ نہ تھا۔ تاہم خلعت ہفت پارچہ کی اُمید میں تھا۔

قصّہ کوتاہ کلیم شیخ چلّی کے سے منصوبے سوچتا ہوا اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہنچا۔ ہر چند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی لیکن مرزا جیسے نکھٹو بے فکرے کبھی کی لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے دروازے پر دستک دی تو جواب ندارد۔ اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس شخص کی کیفیت یہ تھی کہ شاید اس کا نانا۔ وہ بھی حقیقی نہیں، ابتدائے عملداری سرکار میں صاحب رزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اول تو ایسی عالی جاہ سرکار، دوسرے باعتبار منصب اردلی کا جمعدار، تیسرے ان دنوں کی بے عنوانی

اس پر خود اس کی رشوت ستانی۔ بہت کچھ کمایا۔ یہاں تک کہ اس کا شمار دلی کے رو داروں میں ہوگیا۔ مرزا کی ماں اوائل عمر میں بیوہ ہوگئی۔ جمعدار نے باوجودیکہ دُور کی قرابت تھی حسبتہً للہ اس کا تکفل اپنے ذمہ لیا۔ جمعدار اپنی حیات میں اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اس کی ماں کو بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہوگی۔ لیکن جمعدار کے مرنے پر اس کے بیٹے پوتے نواسے کثرت سے تھے۔ انھوں نے بے اعتنائی کی اور اگرچہ جمعدار نے بہت کچھ وصیت کرکے مرے تھے مگر ان کے ورثا نے بہ ہزار دقت محل سرا کے پہلو میں ایک بہت چھوٹا سا قطعہ ان کے رہنے کو دیا۔ اور سات روپے مہینہ کے کرایے کی دکانیں مرزا کے نام کردیں۔ یہ تو حال تھا کہ مرزا، مرزا کی ماں، مرزا کی بیوی۔ تین تین آدمی اور سات روپے کی کل کائنات، اس پر مرزا کی شیخی اور نمود۔ یہ مسخرا اس ہستی پر چاہتا تھا کہ جمعدار کے بیٹوں کی برابری کرے جن کی صدہا روپیہ ماہوار کی مستقل آمدنی تھی۔

اگرچہ جمعدار والے اس کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ مگر یہ بے غیرت زبردستی ان میں گھستا تھا۔ یہ کسی کو بھائی جان، کسی کو ماموں جان، کسی کو خالو جان بناتا اور وہ لوگ اس کے ادعائی رشتہ ناتوں سے جلتے اور دق ہوتے۔ اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا۔ اس کے حق میں اور بھی زبوں تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی اس نے تمام عادتیں امیرزادوں کی سی اختیار کررکھی تھیں۔ مگر امیرزادگی نبھے تو کیسے نبھے۔ دکانیں گروی ہوتی جاتی تھیں۔ ماں بے چاری بہتیرا بکتی مگر کون سنتا تھا۔ مرزا کو جب دیکھو پاؤں میں ڈیڑھ حاشیے کی جوتی، سر پر دوہری بیل کی بھاری کامدار ٹوپی، بدن میں ایک جھوڑ دو دو انگرکھے، اوپر شبنم یا ہلکی تن زیب، نیچے کوئی طرحدار ساڈھاکے کا تنزیب۔ جاڑا ہوا تو بانات، مگر سات روپے گز سے کم نہیں۔ خیر یہ تو صبح و شام اور تیسرے پہر کا شانی مخمل کی آصف خانی جس میں حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کمخواب کی عمدہ بیل ٹنکی ہوئی۔ سُرخ نیفہ پائجامہ اگر ڈھیلے پائچوں کا ہوا تو کلی دار اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو دو قدم آگے، اور تنگ مہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں اور اوپر جلد بدن کی طرح مڑھا ہوا، ریشمی ازار بند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا اور اس میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھا۔ غرض دیکھا تو مرزا صاحب اس ہیئت کذائی سے چھیلا بنے ہوئے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جارہے ہیں۔

کلیم اور مرزا سے محفل مشاعرہ میں تعارف پیدا ہوا۔ شدہ شدہ مرزا صاحب

کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے۔ یہاں تک کر اب چند روزے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی گو گویا ایک جان دو قالب تھے۔ کلیم کا مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی کبھی اتفاق نہیں ہوا مگر مرزا شام کو تو کبھی کبھی لیکن صبح کو بلا ناغہ آتے اور تمام تمام دن کلیم کے پاس رہتے۔ مرزا نے اپنا حال اصلی کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعدار کا تمام ترکہ مرزا کو ملا اور وہ جمعدار کی محل سرا کو مرزا کی محل سرا اور جمعدار کے دیوان خانہ کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کے نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا اور اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا تو سیدھا جمعدار کی محل سرا کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا۔ بار بار کے پکارنے اور کنڈی کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لیے ہوئے اندر سے نکلیں اور ان میں سے ایک نے پوچھا۔ "کون صاحب ہیں اور اتنی رات گئے کیا کام ہے؟"

کلیم۔ جاؤ مرزا کو بھیج دو۔

لونڈی۔ کون مرزا؟

کلیم۔ مرزا ظاہر دار بیگ جن کا مکان ہے۔ اور کون مرزا!

لونڈی یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں ہے۔

اتنا کہہ کر قریب تھا کہ لونڈی پھر کواڑ بند کرلے کہ کلیم نے کہا کہ "کیوں جی! کیا یہ جمعدار صاحب کی محل سرا نہیں ہے؟"

لونڈی۔ ہے کیوں نہیں۔

کلیم۔ پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں۔ کیا ظاہر دار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں؟

لونڈی۔ جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے۔ موا ظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہوتا ہے۔

دوسری لونڈی۔ اری کمبخت! یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں۔ وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بتایا کرتا ہے۔ (کلیم کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں میاں! وہی ظاہر دار بیگ نا۔ جن کی رنگت زرد زرد ہے۔ آنکھیں کرنجی۔ چھوٹا قد۔ دبلا ڈیل۔ اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں۔

کلیم — ہاں ہاں ۔ وہی ظاہر دار بیگ ۔

لونڈی — تو میاں اس مکان کے پچھواڑے، اپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے ۔ وہ اس میں رہتے ہیں ۔

کلیم نے وہاں جا آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب ننگ دھڑنگ جانگیہ پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے "آہا ! آپ ہیں ۔ معاف کیجیے گا میں نے سمجھا کوئی اور صاحب ہیں ۔ بندے کو کپڑے پہن کر سونے کی عادت نہیں ۔ میں ذرا کپڑے پہن آؤں تو آپ کے ہم رکاب چلوں ۔"

کلیم — چلیے گا کہاں ! میں آپ کے پاس تک آیا تھا ۔

مرزا — پھر اگر تشریف رکھنا منظور ہو تو میں اندر پردہ کرا دوں ۔

کلیم — میں آج شب کو آپ ہی کے ہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں ۔

مرزا — بسم اللہ ! تو چلیے اس مسجد میں تشریف رکھیے ۔ بڑی پُر فضا جگہ ہے ۔ میں بھی آیا ۔

کلیم نے جو مسجد میں آ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت پرانی چھوٹی سی مسجد ہے وہ بھی مسجد مزار کی طرح ویران، وحشت ناک، نہ کوئی حافظ ہے نہ مُلّا، نہ طالب علم نہ مسافر ۔ ہزارہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں کہ ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں ۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ خود کھر بجے کا فرش بن گیا ہے ۔ مرزا کے انتظار میں کلیم کو چار و ناچار اسی مسجد میں ٹھیرنا پڑا ۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا ۔ قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے، مرزا صاحب خود ہی فرمانے لگے کہ بندے کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے ۔ خفقان کا عارضہ اختلاج قلب کا روگ ہے ۔ اب جو میں آپ کے پاس سے گیا تو ان کو غشی میں پایا، اس وجہ سے دیر ہوئی پہلے تو یہ فرمائیے کہ اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے ؟

کلیم نے باپ کی طلب، اپنا انکار، بھائی کی التجا، ماں کا اصرار، تمام ماجرا کہہ سنایا ۔

مرزا — پھر اب کیا ارادہ ہے ؟

کلیم — سوائے اس کے کہ اب گھر لوٹ کر جانے کا ارادہ تو نہیں ہے ۔ اور جو آپ کی صلاح ہو !

مرزا۔ نیت شب حرام۔ صبح تو ہو۔ آپ بے تکلف استراحت فرمایئے۔ میں جاکر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں۔ اور مریضہ کی تیمارداری کے لیے اجازت دیجیے کہ آج اس کی علالت میں اشتداد ہے۔

کلیم۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دوہری محل سرائیں متعدد دیوان خانے کئی پائین باغ ہیں۔ حوض اور حمام اور کٹڑے اور گنج اور دوکانیں اور سرائیں ہیں۔ میں تو جانتا ہوں عمارت کی قسم سے کوئی چیز ایسی نہ ہوگی جس کو تم نے اپنی ملک نہ بتاتا ہو۔ یا یہ حال ہے کہ ایک متنفس کے واسطے ایک شب کے لیے تم کو جگہ میسّر نہیں۔ جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کیے یہ ثابت ہوتا تھا کہ جمعدار کے تمام ترکے پر تم قابض اور متصرف ہو لیکن میں اس تمام جاہ و حشمت کا ایک شمہ بھی نہیں دیکھتا۔

مرزا۔ آپ کو میری نسبت سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجب کی بات ہے۔ اتنی مدّت مجھ سے آپ سے صحبت رہی مگر افسوس ہے آپ نے میری طبیعت اور میری عادت کو نہ پہچانا۔ یہ اختلاف حالت جو آپ دیکھتے ہیں اس کی وجہ ایک ہے۔ بندہ کو جمعدار صاحب مرحوم مغفور نے متبنّیٰ کیا تھا اور اپنا جانشین کر مرے تھے۔ شہر کے کل رؤسا اس سے واقف اور آگاہ ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں کیں۔ بندے کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں دُور بھاگتا ہے۔ صحبت ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا۔ لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ، بندوبست کا حوصلہ نہیں۔ اسی روز سے اندر باہر واویلا مچی ہوئی ہے اور اس بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منالے جائیں۔

کلیم۔ لیکن آپ نے اس کا تذکرہ کبھی نہیں کیا؟

مرزا۔ اگر آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا تو استقلال مزاج سے بے بہرہ اور غیرت و حمیت سے بے نصیب ٹھہرتا۔ اب آپ کو کھڑا رہنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اجازت دیجیے کہ میں جاکر بچھونا بھجوادوں اور مریضہ کی تیمارداری کروں۔

کلیم۔ مقام مجبوری ہے لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجیے۔ تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے۔

مرزا۔ چراغ کیا میں نے لمپ روشن کرانے کا ارادہ کیا تھا لیکن گرمی کے دن ہیں۔ پروانے بہت جمع ہو جائیں گے۔ اور آپ زیادہ پریشان ہو جیے گا۔ اور اس مکان میں

ابابیلوں کی کثرت ہے اور روشنی دیکھ کر گرنے شروع ہو جائیں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے۔ تھوڑی دیر صبر کیجیے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔

کلیم جب گھر سے نکلا تھا تو کھانا تیار تھا لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اس نے کھانے کی مطلق پروا نہ کی اور بے کھائے نکل کھڑا ہوا۔ مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود پوچھیں ہی گے تو کہہ دوں گا۔ مرزا کو ہر چند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا کیوں کہ اول تو کچھ ایسی رات زیادہ نہیں گئی تھی۔ دوسرے یہ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے لڑ کر نکلا ہے۔ تیسرے دونوں میں بے تکلفی غایت درجہ کی تھی لیکن مرزا قصداً اس بات سے متعرض نہ ہوا اور کلیم بے چارے کا بھوک کے مارے یہ حال کہ مسجد میں آنے سے پہلے اس کی انتڑیوں نے قل ہو اللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا اور عنقریب تمام شب کے واسطے رخصت ہوا چاہتا ہے تو بے چارے نے بے غیرت بن کر خود کہا کہ

سنو یار! میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔

مرزا۔ سچ کہو۔ نہیں جھوٹ بہکاتے ہو!

کلیم۔ تمھارے سر کی قسم میں بھوکا ہوں۔

مرزا۔ مرد خدا تو آتے ہی کیوں نہیں کہا۔ اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے؟ دوکانیں سب بند ہو گئیں۔ اور جو دو ایک کھلی بھی ہیں تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی۔ جن کے کھانے سے فاقہ بہتر ہے۔ گھر میں آج آگ تک نہیں سلگی مگر ظاہرا تم سے بھوک کی سہار ہونی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ دیو اشتہا کو زیر کرنا بڑی ہمت والوں کا کام ہے۔ ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے کہ جاؤں چھدامی بھڑ بھونجے کے یہاں سے گرم گرم خستہ چنے کی دال بنوا لوں، بس ایک دھیلے کی مجھ کو اور تم کو دونوں کو کافی ہوگی۔ رات کا وقت ہے۔ ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اُٹھ کر باہر گئے اور چشم زدن میں چنے بھنوا لائے، مگر دھیلے کے کہہ کر گئے تھے۔ یا تو کم لائے یا راہ میں دو چار پھنکے لگائے۔ اس واسطے کہ کلیم کے روبرو دو تین مٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے۔

مرزا۔ یار ہو تم بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا۔ ذرا واللہ ہاتھ تو لگاؤ۔ دیکھو کیسے بھاس رہے ہیں۔ اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجیب ہی دل فریب ہے کہ

بس بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ کوئی فن ہو، کمال بھی کیا چیز ہے۔ دیکھیے اتنی تورات گئی ہے مگر چھدامی کی دوکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بندے نے تحقیق سنا ہے کہ حضور والا کے خاصے میں چھدامی کی دوکان کا چنا لگ کر جاتا ہے اور واقع میں ذرا آپ غور سے دیکھیے کیا کمال کرتا ہے کہ بھونتے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے۔ بھئی تمھیں میرے سر کی قسم سچ کہنا ایسے خوب صورت خوش قطع سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے؟ دال بنانے میں اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانے پر خراش تک نہیں۔ ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور، اور دانوں کی رنگت دیکھیے کوئی بسنتی ہے، کوئی پستئی، غرض دونوں رنگ خوش نما، یوں تو صدہا قسم کے غلّے اور پھل زمین سے اُگتے ہیں۔ لیکن چنے کی لذت کوئی نہیں پاتا۔

محمد حسین آزاد

نور جہاں

ملک ایران میں خواجہ محمد شریف ایک عہدہ دار بادشاہ کا تھا۔ چونکہ آدمی بالیاقت اور صاحب تدبیر تھا۔ بڑھتے بڑھتے بادشاہ کے دربار میں وزارت کے مرتبہ کو پہنچ گیا۔ چند روز بعد اس کا انتقال ہوا۔ مگر وارثوں سے فلک نے دغا کی۔ مرزا غیاث الدین اس کا بیٹا ایسا تباہ ہوا کہ معاش کی تلاش میں گھر سے نکلا اور ایک قافلے کے پیچھے پیچھے مع عیال ہندوستان کو روانہ ہوا۔ بی بی حاملہ تھی۔ اسی حالت میں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ بے سروسامانی کا سفر، جنگل کا مقام، محلوں کے بیٹھنے والے ماں باپ نے ساری رات جنگل میں روتے روتے کاٹی۔ صبح ہوئے پھر روانہ ہوئے۔ مگر لڑکی جو ایسے نحوست کے وقت میں پیدا ہوئی تھی اس کا لے چلنا سخت مشکل ہوا۔ آخر اس نے اپنی حالت اور بیٹی کے انجام کو سوچا۔ کہا کہ خدا پر توکل کرو اور اس کی قسمت کے حوالے کرکے یہیں چھوڑ دو۔ ہر چند ممتا کی آگ گود سے اتارنے نہ دیتی تھی مگر کچھ بن نہ آئی تو ماں نے بھی کلیجے کے ٹکڑے کو زمین پر رکھ دیا۔ اور روتی چلی گئی۔ ایک رات کی جان جنگل میں پڑی روتی تھی۔ تھک جاتی تو ہاتھ چوسنے لگتی تھی مگر قسمت سرہانے کھڑی ہنستی تھی کہ جلدی نہ کر جس محل میں تجھے ملکہ بنا کر بٹھانا ہے۔ وہ ابھی تعمیر نہیں ہوا۔ پیچھے پیچھے ایک قافلہ بھی آتا تھا۔ اس صبح کے تارے کو زمین پر پڑا دیکھ کر سب حیران ہو گئے۔ سوداگر کے دل میں خدا نے ڈالا۔ گود میں لیے منزل پر آیا، اس جنگل بیابان میں دودھ کہاں، سارے قافلے میں اس بات کا چرچا تھا۔ کسی کو مرزا غیاث کا بھی خیال آیا۔ سوداگر سے کہا کہ وہ فلک زدہ جو قافلہ کے ہمراہ ہے، اس کے عیال بھی ساتھ ہیں۔ اگر سپرد کرو تو عجب نہیں کہ اس بچی کی جان بچ جائے۔ غرض کچھ اجرت پر لڑکی اس کے حوالے ہو گئی۔ اتنی برکت تو پیدا ہوتے ہی معلوم ہوئی کہ کچھ کھانا قافلے سے آنے لگا۔ اور ایک سواری مل گئی۔ سوداگر نے جب مرزا غیاث کی لیاقت اور خاندان کا حال معلوم کیا تو بہت افسوس کیا اور ہندوستان میں پہونچ کر اکبر کے دربار میں پہنچایا۔ ہمایوں

بادشاہ جب ہرات میں پہونچا تو خواجہ شریف یعنی مرزا غیاث کا باپ ہرات کا حاکم تھا۔ اس وقت بادشاہ کی بہت خدمت کی تھی، چنانچہ مرزا غیاث نے باپ کے حقوق کو سفارش میں پیش کیا اور چونکہ خود بھی محاسب، خوش نویس اور شاعر خوش تقریر تھا، دیوان بیوتات ہو گیا۔ جس طرح اور امراء کی بیویاں محل میں جایا کرتی تھیں اسی طرح مرزا غیاث کی بیوی بھی جایا کرتی تھی بلکہ اس کا بیگم سے بہناپا ہو گیا تھا۔ اسی عرصے میں لڑکی بھی بڑی ہو گئی تھی۔ اس کا نام مہرالنساء رکھا گیا۔ چنانچہ ماں کے ساتھ بیٹی بھی جایا کرتی تھی۔ ایک دن مینا بازار میں پھرتی تھی۔ جہانگیر ان دنوں شاہزادہ تھا۔ مہرالنساء کا البیلے پن سے چمن میں پھرنا بہت بھایا۔ آپ پھول توڑنے لگا اور اس سے کہا۔ "بی لڑکی! ذرا ہمارے کبوتر تو لیے رہو۔" مہرالنساء نے کبوتر اس کے ہاتھ سے لے لیے۔ اتفاقاً ایک کبوتر ہاتھ سے پھڑک کر چھوٹ گیا۔ جب شہزادہ اس طرف متوجہ ہوا۔ کہا۔ "ہیں میرا کبوتر کیا ہوا۔" اس نے کہا۔ "صاحب عالم وہ تو اڑ گیا۔" شاہزادے نے کہا۔ "کیونکر؟" اس نے دوسرا بھی اڑا دیا کہ حضور اس طرح اُڑ گیا۔ یہ بھولے پن کی ادا اس وقت ایسی معلوم ہوئی کہ شہزادے کو ایک خیال پیدا ہو گیا۔ ماں کو جب یہ معلوم ہوا تو بیگم سے شکایت کی اور بیٹی کو محل میں لے جانا چھوڑ دیا۔ بلکہ رفتہ رفتہ یہ شکایت بادشاہ کے کان تک پہنچی۔ اکبر بہت خفا ہوا۔ بیٹے کو خلوت میں بلا کر سمجھایا۔ ساتھ ہی اس کے مرزا غیاث کی بیوی سے کہا کہ تم اپنی بیٹی کی کہیں شادی کر دو۔ اور چند روز اسے جہانگیر کی آنکھوں سے الگ رکھو۔ علی قلی خاں ایک شخص شاہ ایران کے نعمت خانے کا داروغہ تھا۔ وہ بادشاہ کے مرنے کے بعد انقلاب سلطنت سے ملتان میں آنکلا۔ عبدالرحیم خاں خاناں ان دنوں بھکر میں لڑتا تھا۔ اس سے ملاقات ہوئی اور معرکے میں بڑی بڑی جانبازیاں کیں۔ جب خان خاناں دربار میں آیا تو اسے بھی دربار میں حاضر کیا۔ علی قلی خاں جیسا لئیق، بہادر تھا ویسا ہی صورت کا وجیہہ تھا۔ اکبر نے ایک معزز عہدہ دے کر اس سے مہرالنساء کی شادی کر دی اور ڈھاکے کا صوبہ دار کر کے بھیج دیا۔ مہرالنساء حسن و خوبی کے ساتھ عقل کی پتلی اور لطائف و ظرافت میں بلبل ہزار داستان تھی۔ چند روز میں میاں کو غلام بنا لیا۔ علی قلی خاں کو فن رمل میں بھی دخل تھا۔ ایک دن زائچہ دیکھ رہا تھا۔ بیگم نے کہا ذرا میرا بھی زائچہ تو دیکھو۔ اس نے قرعہ پھینکا اور دیکھ کر کہا کہ بیگم سر پر چتر شاہی قربان ہوتا نظر آتا ہے۔ بیگم ہنسنے لگی مگر ساتھ ہی جہانگیر کا معاملہ دل میں کھٹک گیا۔ الغرض جب جہانگیر بادشاہ ہوا تو پھر اس کی

نیت برگشتہ ہوئی۔ علی قلی خاں کو بہانے سے بلا بھیجا۔ اور چاہا کہ کسی ایسے ڈھب سے مروا ڈالے کہ جس کا الزام اس پر نہ آئے۔ چنانچہ ایک دن اس کی شجاعت اور بہادری کی بہت سی تعریف کرکے مست ہاتھی کے سامنے کر دیا۔ اس شیر جنگ نے اسے مار ہٹایا۔ پھر ایک شیر سے نہتا بھڑا دیا۔ اس نے اسے بھی بے ہتھیار مارا اور شیر افگن خطاب لیا۔ جب یہ وار نہ چلا تو ایک راز دار کی زبانی صاف پیغام بھیجا۔ اس غیرت والے کی غیرت نے گوارا نہ کیا اور سوچ سمجھ کر یہی مناسب دیکھا کہ اس نوکری پر لعنت کرکے اپنی جاگیر پر جا بیٹھے۔ بادشاہ نے قطب الدین خاں کو وہاں کا صوبہ دار کرکے بھیجا اور اشارہ کر دیا کہ جس طرح ہو اس کا کام تمام کر دے۔ شیر افگن بے خبر بردوان میں اپنی جاگیر پر بیٹھا تھا۔ سنتے ہی استقبال کو آیا۔ دو چار جاں نثار اس کے ہمراہ تھے۔ قطب الدین کے آدمیوں نے انھیں فوراً گرفتار کر لیا۔ شیر افگن خاں یہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ سمجھا کہ معاملہ بگڑ گیا۔ تلوار گھسیٹ کر کوکا جی کے ایک ایسا ہاتھ مارا کہ دو ٹکڑے ہو کر ہزار سالہ مردوں میں جا ملے۔ بادشاہی سپاہی دیکھتے ہی ٹوٹ پڑے اور اس تن تنہا کی بوٹی بوٹی بانٹ لی۔ سب گھر بار لوٹ کر دربار روانہ ہوئے مگر مقصد اسی گوہر شب چراغ سے تھا۔ چنانچہ اب تو پردہ بھی درمیان سے اٹھ گیا تھا۔ ایک بی بی کھلم کھلا پیغام لے کر آئیں۔ مہر النساء سن کر آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور بولی۔ "شیر افگن جیسے خاوند کو گنوا کر دوسرے کا منہ دیکھنا ننگ وفا کا منہ کالا کرنا ہے۔ بی بی تم میری طرف سے حضور میں عرض کرو کہ خیر جہاں پناہ، اس بدنصیب پر جو کچھ گزر گئی اس کی تقدیر ہی میں لکھا تھا مگر بیوہ بے کس پر اب رحم فرمائیں مگر جہانگیر اس روکھے پن سے بہت اچاٹ ہوا۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد ماں کو اشارہ کیا کہ مہر النساء کو اپنے مصاحبوں میں رکھ لو۔ مدت اس طرح بھی گذری۔ غرض آخر کو یہ ہوا کہ مہر النساء سے نور محل اور نور محل سے نور جہاں بادشاہ بیگم بن کر نور الدین جہانگیر کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

خواجہ حسن نظامی

گل بانو

شہزادہ مرزا دارا بخت بہادر شاہ کے پہلے ولی عہد تھے۔ جو ۱۸۴۹ء میں ۱۸۵۷ء سے آٹھ برس پہلے مر گئے تھے۔ ان کی ایک لڑکی گل بانو تھی جو ڈومنی کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ اور بہت خوبصورت تھی۔ یہ قصہ اسی گل بانو کا ہے جو ۱۸۵۷ء کی مصیبتوں سے برباد ہو کر اپنے باپ کی قبر پر چلی گئی جو درگاہ چراغ دہلی میں تھی۔ یہ درگاہ نئی دہلی سے جنوب میں تین میل کے فاصلہ پر ہے اور اسی درگاہ میں نمونیے کی بیماری سے مر گئی اور وہیں دفن ہوئی اب اس کا قصہ سنیے جو بالکل سچا واقعہ ہے۔

گل بانو خدا رکھے پندرہ برس کی ہوئیں۔ جوانی کی راتوں نے گود میں لینا شروع کیا۔ مرادوں کے دن پہلو میں گدگدیاں کرنے لگے۔ یہ مرزا دارا بخت بہادر ولی عہد اول بہادر شاہ کی نور چشم ہیں۔ باپ نے بڑے چاؤ اور چوچلے سے پالا ہے اور جس دن سے وہ دنیا کو چھوڑ کر قبر میں گئے، محل میں گل بانو کی ناز برداریاں پہلے سے زیادہ ہونے لگیں۔ اماں کہتیں، انگوڑی کے ننھے سے دل کو باپ کے مرنے کا بہت صدمہ پہنچا ہے۔ باپ کا ہڑکا نہ کرے۔ اس کی ایسی دلداری کرو کہ ان کی محبتوں کو بھول جائے۔

ادھر دادا یعنی بہادر شاہ کا یہ عالم تھا کہ پوتی کے لاڈ و پیار میں کسی بات کی کمی نہیں ہونے دیتے تھے۔ جو مانگتی تھی دیتے تھے۔ جو چاہتی تھی فوراً پورا کرتے تھے اور شاہی محلوں میں گل بانو کی دھوم تھی کہ جہاں پناہ سب سے زیادہ گل بانو کو چاہتے ہیں اور اس کے سامنے اپنی محبوب ملکہ زینت محل کے لڑکے جواں بخت بہادر کی الفت کو بھی بھول گئے ہیں۔

بس ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ گل بانو کس شان اور کس شوکت اور کیسے آرام اور کتنے عیش سے زندگی بسر کرتی ہو گی اور اس کو ساری دنیا اپنی لونڈی معلوم ہوتی ہو گی۔

اگرچہ مرزا دارا بخت مرحوم کے اور بھی کئی بچے تھے مگر گل بانو اور اس کی والدہ سے تو ان کو عشق تھا گل بانو کی ماں ایک ڈومنی تھی مگر مرزا اسے تمام بیگمات سے زیادہ چاہتے تھے۔

جب مرزا دارا بخت کا انتقال ہوا تو گل بانو ۱۲ سال کی تھی اور ہر مہینے کی نوچندی جمعرات کو اپنی ماں کے ساتھ درگاہ حضرت چراغ دہلی میں اپنے باپ کی قبر پر جایا کرتی تھی۔ وہاں جاتی تو باپ کی قبر کو لپٹ جاتی اور خوب روتی اور کہتی۔" ابا حضرت! آپ کہاں چلے گئے؟ ہم کو بھی اپنے پاس بلا لیجیے۔ ہم بھی آپ کے پاس لیٹیں گے۔ ہم آپ کو روز یاد کرتے ہیں اور ہمارا دل آپ کے بغیر گھر میں نہیں لگتا۔" ماں کہتی۔" بیٹی! دور پار۔ دشمن مدعی۔ ایسی بات نہیں کہا کرتے۔ نوج خدا نہ کرے جو تم ابا کے پاس جاؤ۔ ابھی تم نے دنیا کا دیکھا ہی کیا ہے۔ میرے اندھیرے گھر کا بس تم ہی ایک چراغ ہو۔ ایسی بد فالی کی باتیں زبان سے نہ نکالو میرا دل ہلا جاتا ہے، خدا تمھارے سہرے کی گھڑی دکھائے۔ پھلو، پھولو، شاد رہو، آباد رہو، ابا حضرت بہشت میں ہیں اور بہشت کی کھڑکی سے تمھیں دیکھ رہے ہیں۔ تم جی ہلکا نہ کرو۔ وہ بھی تم کو بھولے نہیں ہیں اور ہمیشہ تم کو یاد کرتے ہیں۔ جنت کے اندر تمھارے لال قلعے اور اس کے باغ سے بھی اچھے محل اور باغ ہیں۔" گل بانو کہتی " تو اچھا بولتے کیوں نہیں؟ ہم سے بات کیوں نہیں کرتے؟ کیا انھوں نے قبر کے اندر کسی اور کو بیٹی بنا لیا ہے یا جنت کی کسی حور کی لڑکی ان کی بیٹی بن گئی ہے۔"

گل بانو نے پندرھویں سال میں قدم رکھا تو شباب نے بچپن کی ضد اور شرارتیں تو رخصت کر دیں مگر دل ربائی کی شوخیاں اس قدر بڑھا دیں کہ محل کا بچہ بچہ گل بانو سے پناہ مانگتا تھا۔

گل بانو سنہری چھپر کھٹ میں دوشالہ تانے سویا کرتی تھیں۔ شام کو چراغ جلے اور بانو کو نیند آئی۔ اور سیدھی چھپر کھٹ میں پہنچیں۔ ماں کہتی " چراغ میں بتی پڑی لاڈو پلنگ چڑھی۔" تو گل بانو مسکرائی اور جمائی لے کر سر کے بکھرے ہوئے بالوں کو ماتھے سے سمیٹ کر کہتی " اچھا بی تم کو کیا؟ سوتے ہیں وقت کھوتے ہیں۔ تمھارا کیا لیتے ہیں تم ناحق کو لوٹوں پر لوٹی جاتی ہو۔"

ماں کہتی " نا بنو! میں جلتی نہیں، شوق سے آرام کرو۔ خدا تم کو ہمیشہ سکھ کی نیند سلا تا رکھے۔ میرا مطلب تو یہ تھا کہ زیادہ سونا آدمی کو بیمار کر دیتا ہے۔ تم شام کو جلدی سو جاتی

ہو تو صبح ذرا جلدی اٹھا کرو مگر تمھارا تو یہ حال ہے کہ دس بج جاتے ہیں۔ گھر میں دھوپ پھیل جاتی ہے۔ لونڈیاں ڈر کے مارے بات تک نہیں کر سکتیں کہ بانو کی آنکھ کھل جائے گی۔ ایسا بھی کیا سونا۔ آدمی کو کچھ گھر کا کام بھی دیکھنا چاہیے۔ اب ماشاءاللہ تم جوان ہوئیں۔ پرائے گھر جانا ہے۔ اگر یہی عادت رہی تو وہاں کیونکر گزارہ ہوگا؟"

گل بانو ماں کی یہ باتیں سُن کر بگڑتی اور کہتی: "تم کو ان باتوں کے سوا کچھ اور بھی کہنا آتا ہے۔ ہم سے نہ بولا کرو۔ تمھیں ہم دو بھر ہو گئے ہیں تو صاف صاف کہدو۔ ہم اپنے دادا حضرت (بہادر شاہ) کے پاس جا رہیں گے، ان کو ہم دو بھر نہیں ہیں۔ وہ تو ہم کو اپنی آنکھوں کا تارا سمجھتے ہیں اور ہم کو ہاتھوں چھاؤں رکھتے ہیں۔ اتنا پیار تو وہ کسی سے بھی نہیں کرتے۔ کل چچا جواں بخت کو ہٹا کر مجھے پاس بٹھا لیا تھا۔" اماں کہتی "بیٹی ناحق بگڑتی ہو، تمھارے ہی بھلے کی بات کہی تھی، بے شک تمھارے دادا حضرت تم کو بہت چاہتے ہیں۔ مگر میں بھی تمھاری ماں ہوں۔ مجھ سے زیادہ تمھارا چاہنے والا کوئی نہیں ہو سکتا۔"

اسی زمانے کا ذکر ہے کہ مرزا داور شکوہ شہزادہ خضر سلطان کے بیٹے گل بانو کے پاس آنے جانے لگے۔ لال قلعہ دہلی کے شاہی خاندان میں باہمی پردے کا دستور نہ تھا یعنی شاہی خاندان کے آدمی آپس میں پردہ نہ کرتے تھے۔ اس واسطے مرزا داور بے روک ٹوک گل بانو کے گھر آتے جاتے اور گل بانو ان سے پردہ نہ کرتی تھیں۔ پہلے تو گل بانو ان کی بہن، اور مرزا داور اُن کے چچازاد بھائی تھے اور چچا تایا کے دو بچے سمجھے جاتے تھے لیکن بعد میں عشق نے ایک اور رشتہ پیدا کیا۔ مرزا داور گل بانو کو کچھ اور سمجھتے تھے اور گل بانو داور کو اس قرابت کے سوا کسی اور رشتے کی نظر سے دیکھتی تھی۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت مرزا داور گل بانو کے پاس آئے تو دیکھا کہ بانو کالا دوشالا اوڑھے سنہری چھپر کھٹ میں سفید پھولوں کی سیج پر پاؤں پھیلائے بے خبر پڑی سوتی ہیں، منھ کھلا ہوا ہے، اپنے ہی بازو پر سر رکھا ہوا ہے۔ تکیہ الگ پڑا ہے، دو دو لونڈیاں پاس کھڑی مکھیاں اڑا رہی ہیں۔

داور شکوہ گل بانو کی ماں یعنی اپنی چچی کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگے مگر کن انکھیوں سے گل بانو کا یہ عالم مخموری و بے خودی دیکھتے جاتے تھے۔ آخر نہ رہا گیا اور بولے "کیوں چچی حضرت! بانو اتنے دن چڑھے تک سوتی رہتی ہیں؟ دھوپ قریب آ گئی اب تو ان کو جگا دینا چاہیے۔"

بچی نے جواب دیا۔" بیٹا کیا بتاؤں۔ تم بانو کے مزاج کو جانتے ہو۔ کس کی شامت آئی ہے۔ جو اُن کو جگائے۔ آفت برپا ہو جائے گی، ہر ماما اصیل کوڑے کھائے گی۔" مرزا داور نے کہا۔ " دیکھیے میں جگاتا ہوں، دیکھوں کیا کرتی ہیں؟" بچی ہنس کر کہنے لگیں۔" جگا دو۔ تم سے کیا کہیں گی، تمہارا بہت لحاظ کرتی ہیں۔" داور نے گل بانو کے چھپر کھٹ کے پاس جا کر گل بانو کے تلوے میں گدگدیاں کیں۔ بانو نے انگڑائی لے کر پاؤں سمیٹ لیا اور بے اختیار آنکھیں کھول کر نگاہ طیش سے پائنتی کی طرف دیکھا۔ ان کو خیال تھا کہ ان کی کسی لونڈی نے یہ شرارت کی ہے۔ اس کو گستاخی کی سزا دینی چاہیے مگر جب انھوں نے ایسے شخص کو سامنے کھڑا دیکھا جس سے خود بخود ان کا دل محبت کرتا تھا تو شرم سے انھوں نے دوشالے کا آنچل اپنے چہرے پر ڈال لیا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھیں۔ داور نے اس ہوش پاش منظر کو دل تھام کر دیکھا اور بے اختیار ہو کر کہنے لگے۔" لو بچی حضرت! میں نے بانو کو اٹھا بٹھایا۔"

آخر محبت نے اتنی ترقی کی کہ قلعے میں چرچے ہونے لگے تو گل بانو کی ماں نے مرزا داور شکوہ کا اپنے گھر آنا بند کرا دیا اور اس روک ٹوک کے سبب ان دونوں کے جذباتِ محبت بہت بڑھ گئے۔

گل بانو اور مرزا داور کے ہجر و فراق کا زمانہ بڑھتا ہی جاتا تھا، یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا۔ مرزا خضر سلطان اور ان کے بیٹے مرزا داور اور بادشاہ وغیرہ لال قلعے سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں چلے گئے۔ بادشاہ وہاں سے لال قلعے میں لائے گئے اور مرزا خضر سلطان اور ان کے بھائی بیٹے دہلی کے موجودہ جیل خانے کے سامنے باغی فوج کی سرداری کے جرم میں قتل کیے گئے اور گل بانو کی ماں دہلی فتح ہونے سے پہلے ہیضہ کر کے مر گئیں اور گل بانو جنگلوں میں ماری ماری پھرتی رہیں۔ آخر بیکسی اور بے وارثی کی حالت میں درگاہ حضرت چراغ دہلی میں آئیں جہاں ان کے باپ مرزا دارا بخت کی قبر تھی۔

درگاہ حضرت چراغ دہلی کے ایک کونے میں ایک قبول صورت عورت پھٹا ہوا کمبل اوڑھے رات کے وقت خاک کے بستر پر پڑی ہوئی ہائے ہائے کر رہی تھی۔ سردی کے موسم کی بارش زور شور سے ہو رہی تھی، تیز ہوا کے جھونکوں سے بارش کی بوچھار اس جگہ کو تر کر رہی تھی جہاں یہ عورت نمونیے کے سخت بخار میں بیہوش لیٹی تھی۔

پسلی کا درد، بخار اور سردی اور گرم لباس کا نہ ہونا اور گیلی زمین پر بغیر کسی بچھونے کے

لیٹنا اس عورت کے لیے قیامت سے کم نہ تھا۔ آخر بخار کی بے ہوشی میں اس عورت نے آواز دی، "گل بدن۔ اری او گل بدن۔ مردار مر گئی۔ جلدی آ۔ مجھے دوشالہ اوڑھا دے۔ دیکھ بوچھاڑ اندر آتی ہے۔ پردہ چھوڑ دے۔ گل بدن نہیں آتی؟" پھر بولی۔ "روشنک تو ہی آ۔ گل بدن تو کہیں غارت ہو گئی۔ میرے پاس کوئلوں کی انگیٹھی لا۔ پسلی پر تیل مل۔ ارے درد سے میرا سانس رکا جاتا ہے۔" جب کوئی بھی یہ آواز سن کر عورت کے پاس نہ آیا تو اس نے کمبل چہرے سے ہٹایا اور چاروں طرف دیکھا۔ اندھیرے دالان میں خاک کے بچھونے پر اکیلی پڑی تھی۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مینہ سناٹے سے برس رہا تھا۔ بجلی چمکتی تھی تو ایک سفید قبر کی جھلک دکھا دیتی تھی جو اس کے باپ کی قبر تھی۔ یہ حالت دیکھ کر اس عورت نے ایک آہ کا نعرہ مارا اور کہا۔ "بابا میں تمہاری گل بانو ہوں، دیکھو اکیلی ہوں۔ اٹھو مجھے بخار ہے۔ ہائے میری پسلی میں درد بھی ہے اور مجھے سردی بھی لگ رہی ہے اور میرے پاس سوائے اس بوسیدہ کمبل کے اوڑھنے کو بھی کچھ نہیں ہے، میری اماں کہاں ہیں؟ وہ بھی قبر میں جا سوئیں۔ میں شاہی محل سے جلا وطن ہو گئی بابا۔ بابا۔ آج میں پھر کہتی ہوں کہ اپنی قبر میں مجھے بلا لو۔ آج اماں نہیں ہیں جو مجھے بد شگونی کی بات سے روکیں گی۔"

ابا مجھے اس اندھیرے میں بادل کی کڑک اور بجلی کی چمک سے ڈر لگتا ہے۔ کفن سے منہ نکالو اور مجھے دیکھو۔ میں نے پرسوں سے کچھ نہیں کھایا۔ میرے بدن میں اس گیلی زمین کے کنکر چبھتے ہیں۔ میں اینٹ پر سر رکھے لیٹی ہوں۔ میرا چھپر کھٹ کیا ہوا؟ میرا دوشالا کہاں گیا؟ میری پھولوں کی سیج کہاں چلی گئی؟ ابا ابا۔ اٹھو جی، کب تک سوؤ گے، اماں بھی چلی گئیں، دادا بھی قید ہو گئے، شاہی کا چراغ بھی گل ہو گیا، نہ محل رہے نہ شال دوشالے رہے نہ لونڈی غلام رہے۔ کون سنے میرا یہ حال؟ کون دیکھے میرا یہ انقلاب؟ کس کو یقین آئے گا کہ شہنشاہ ہندوستان کی پوتی یوں گیلی خاک پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مری ہو گی، کون مانے گا کہ اس دنیا کے علیش و آرام کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ کس سے کہوں۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے کہ یہ دنیا جی لگانے اور گھمنڈ اور غرور کرنے کی جگہ نہیں ہے۔

آج جو بچے ماں باپ کی محبت اور لاڈ سے خوش ہیں اور ذاتی لیاقت پیدا کرنے سے غافل ہیں وہ ذرا میرا حال دیکھیں کہ میں اپنی ماں کی نصیحت سے بگڑتی تھی اور یہ وقت میرے خواب و خیال میں بھی نہ آتا تھا۔ آہ آہ ؎ جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

یہ کہتے کہتے بیچاری گل بانو مر گئی اور صبح درگاہ والوں نے اس کو اس کے باپ کے پہلو میں دفن کر دیا۔

پطرس

مرحوم کی یاد میں

ایک دن مرزا صاحب اور میں برآمدے میں ساتھ ساتھ کرسیاں ڈالے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب دوستی بہت پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہی حالت ہماری تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ مرزا صاحب تو خدا جانے کیا سوچ رہے تھے۔ لیکن میں زمانے کی ناسازگاری پر غور کر رہا تھا۔ دور سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک موٹر گاڑی گزر جاتی تھی۔ میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کبھی کسی موٹر کار کو دیکھوں، مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے۔ اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں۔ جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر تقسیم کی جا سکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں اور کوئی موٹر اس ادا سے گزر جائے کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری تلی تک پہنچ جائے تو اس دن، میں گھر آ کر علم کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف۔ اے میں پڑھی تھی اور اس غرض سے اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔

میں کچھ دیر تک آہیں بھرتا رہا۔ مرزا صاحب نے کچھ توجہ نہ کی۔ آخر میں نے خاموشی کو توڑا اور مرزا صاحب سے مخاطب ہو کر بولا:

"مرزا! ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟"

مرزا صاحب بولے۔ "بھئی کچھ ہو گا ہی نا آخر۔"

میں نے کہا۔ "میں بتاؤں تمہیں؟"

کہنے لگے۔ "بولو۔"

میں نے کہا۔ "کوئی فرق نہیں۔ سنتے ہو مرزا؟ کوئی فرق نہیں۔ ہم میں اور حیوانوں میں

......کم از کم مجھ میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں! ہاں ہاں میں جانتا ہوں تم مین میخ نکالنے میں بڑے طاق ہو، کہہ دوگے ـــــ حیوان جگالی کرتے ہیں، تم جگالی نہیں کرتے، ان کے دُم ہوتی ہے، تمہارے دم نہیں، لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ان سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے افضل ہیں۔ لیکن ایک بات میں مَیں اور وہ بالکل برابر ہیں۔ وہ بھی پیدل چلتے ہیں، میں بھی پیدل چلتا ہوں۔ اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟ جواب نہیں، کچھ ہے تو کہو۔ بس چپ ہو جاؤ، تم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب سے میں پیدا ہوا ہوں، اس دن سے پیدل چل رہا ہوں، پیدل! تم پیدل کے معنی نہیں جانتے۔ پیدل کے معنی ہیں سینۂ زمین پر اس طرح سے حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک ضرور زمین پر رہے۔ یعنی تمام عمر میرے حرکت کرنے کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ایک پاؤں رکھتا ہوں اور دوسرا اٹھاتا ہوں دوسرا رکھتا ہوں، پہلا اٹھاتا ہوں، ایک آگے ایک پیچھے، ایک پیچھے ایک آگے۔ خدا کی قسم اس طرح کی زندگی سے دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ حواس بے کار ہو جاتے ہیں، تخیّل مر جاتا ہے، آدمی گدھے سے بدتر ہو جاتا ہے۔"

مرزا صاحب میری اس تقریر کے دوران میں کچھ اس بے پروائی سے سگریٹ پیتے رہے کہ دوستوں کی بے پروائی پر رونے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے از حد حقارت اور نفرت کے ساتھ مُنہ ان کی طرف سے پھیر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کو میری باتوں پر یقین نہیں آیا۔ گویا میں اپنی جو تکالیف بیان کر رہا ہوں۔ وہ محض خیالی ہیں یعنی پیدل چلنے کے خلاف شکایت کرنا قابلِ توجہ ہی نہیں یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں، میں نے اپنے دل میں کہا۔ "اچھا مرزا یوں ہی سہی دیکھو تو میں کیا کرتا ہوں۔"

میں نے اپنے دانت پچی کر لیے اور کرُسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا نے بھی سر میری طرف کو موڑا۔ میں مسکرا دیا۔ لیکن میرے تبسم میں زہر ملا ہوا تھا۔ جب مرزا سننے کے لیے تیار ہو گیا تو میں نے چبا چبا کر کہا:

"مرزا مَیں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔"

یہ کہہ کر مَیں بڑے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

مرزا بولے۔ "کیا کہا تم نے؟ کیا خریدنے لگے ہو؟"

میں نے کہا۔ "سُنا نہیں تم نے، میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ موٹر کار ایک ایسی گاڑی ہے، جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں بعض لوگ کار کہتے ہیں لیکن تم ذرا کند ذہن ہو اس لیے میں نے

دونوں لفظ استعمال کر دیے تاکہ تمہیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔"

مرزا بولے۔" ہوں۔"

اب کے مرزا نہیں میں بے پروائی سے سگریٹ پینے لگا۔ بھنویں میں نے اوپر کو چڑھالیں سگریٹ والا ہاتھ منہ تک اس انداز سے لاتا اور ہٹاتا تھا کہ بڑے بڑے ایکٹر اس پر رشک کریں۔

تھوڑی دیر کے بعد مرزا پھر بولے۔" ہوں۔"

میں نے سوچا اثر ہو رہا ہے، مرزا صاحب پر رعب پڑ رہا ہے۔ میں چاہتا تھا مرزا کچھ بولے۔ تاکہ مجھے معلوم ہو کہاں تک مرعوب ہوا ہے۔

لیکن مرزا نے پھر کہا۔" ہوں۔"

میں نے کہا۔" مرزا جہاں تک مجھے معلوم ہے تم نے اسکول اور کالج میں اور گھر پر دو تین زبانیں پڑھی ہیں۔ اور اس کے علاوہ تمہیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی اسکول اور کالج یا شریف گھرانے میں نہیں بولے جاتے پھر بھی اس وقت تمہارا کلام "ہوں" سے آگے نہیں بڑھتا تم جلتے ہو۔ مرزا اس وقت تمہاری جو ذہنی کیفیت ہے اس کو عربی زبان میں حسد کہتے ہیں۔"

مرزا صاحب کہنے لگے۔" نہیں یہ بات تو نہیں۔ میں تو صرف خریدنے کے لفظ پر غور کر رہا تھا۔ تم نے کہا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ تو میاں صاحبزادے خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لیے روپیہ وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وغیرہ کا بندوبست تو بخوبی ہو جائے گا لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرو گے ؟"

یہ نکتہ مجھے کبھی نہ سوجھا تھا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری میں نے کہا۔" اپنی کئی قیمتی اشیاء بیچ سکتا ہوں۔"

مرزا بولے۔" کون کون سی مثلاً۔"

میں نے کہا۔" ایک تو میں اپنا سگریٹ کیس بیچ ڈالوں گا۔"

مرزا کہنے لگے۔" چلو دس آنے تو یہ ہو گئے۔ باقی ڈھائی تین ہزار کا انتظام بھی اسی طرح ہو جائے تو سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کے بعد ضروری یہی معلوم ہوا کہ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لیے روک دیا جائے۔ چنانچہ میں مرزا سے بیزار ہو کر خاموش ہو رہا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ لوگ روپیہ کہاں سے لاتے ہیں؟ بہت سوچا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں۔ اس سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

مرزا بولے ۔" میں تمھیں ایک ترکیب بتاؤں ۔ ایک بائیسکل لے لو۔"

میں نے کہا۔" وہ روپیہ کا مسئلہ تو پھر بھی جوں کا توں رہا۔"

کہنے لگے۔" مفت ۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔" مفت ؟ وہ کیسے ؟"

کہنے لگے۔" مفت ہی سمجھو۔ آخر دوست سے قیمت لینا بھی کہاں کی شرافت ہے، البتہ تم احسان قبول کرنا گوارا نہ کرو تو اور بات ہے۔"

ایسے موقع پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں اس میں معصوم بچے کی مسرت، جوانی کی خوش دلی، اُبلتے ہوئے فواروں کی موسیقی، اور بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں یہ ہنسی ہنسا اور اس طرح ہنسا کر کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اپنی اصلی جگہ پر واپس نہ آئیں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ یک لخت کوئی خوش خبری سننے سے دل کی حرکت بند ہو جانے کا جو خطرہ ہوتا ہے، اس سے محفوظ ہوں تو میں نے پوچھا۔" یہ کس کی ؟"

مرزا بولے۔" میرے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے، تم لے لو۔"

میں نے کہا۔" پھر کہنا، پھر کہنا "

کہنے لگے۔" بھئی ایک بائیسکل میرے پاس ہے، جب میری ہے تو تمھاری ہے، تم لے لو۔"

یقین مانیے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرم کے مارے میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔ چودھویں صدی میں ایسی بے غرضی اور ایثار بھلا کہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ میں نے کرسی سرکا کر مرزا کے پاس کر لی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اپنی ندامت اور ممنونیت کا اظہار کن الفاظ میں کروں۔

میں نے کہا" مرزا صاحب سب سے پہلے تو میں اس گستاخی اور بے ادبی کے لیے معافی مانگتا ہوں جو ابھی ابھی میں نے تمھارے ساتھ گفتگو میں روا رکھی، دوسرے میں آج تمھارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم میری صاف گوئی کی داد دو گے، اور مجھے اپنی رحم دلی کے صدقے معاف کر دو گے۔ میں ہمیشہ تم کو ازحد کمینہ، ممسک، خود غرض اور عیار انسان سمجھتا رہا ہوں، دیکھو ناراض مت ہو، انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے لیکن آج تم نے اپنی شرافت اور دوست پروری کا ثبوت دیا ہے اور مجھ پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ میں کتنا قابل نفرت، تنگ دل اور حقیر شخص ہوں مجھے معاف کر دو۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، قریب تھا کہ میں مرزا کے ہاتھ کو بوسہ دیتا اور اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے اس کی گود میں سر رکھ دیتا لیکن مرزا صاحب کہنے لگے:

"واہ! اس میں میری فیاضی کیا ہوئی۔ میرے پاس ایک بائیسکل ہے جیسے میں سوار ہوا ویسے تم سوار ہوئے۔"

میں نے کہا "مرزا مفت میں نہ لوں گا، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

مرزا کہنے لگے "بس اسی بات سے میں ڈرتا تھا، تم حساس اتنے ہو کہ کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے۔ حالانکہ خدا گواہ ہے، احسان اس میں کوئی نہیں۔"

میں نے کہا "خیر کچھ بھی سہی تم سچ مچ مجھے اس کی قیمت بتا دو۔"

مرزا بولے "قیمت کا ذکر کر کے تم گویا مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو اور جس قیمت پر میں نے خریدی تھی وہ تو بہت زیادہ تھی اور اب تو وہ اتنے کی رہی بھی نہیں۔"

میں نے پوچھا "تم نے کتنے میں خریدی تھی؟"

کہنے لگے "میں نے پونے دو سو روپے میں لی تھی لیکن اس زمانے میں بائیسکلوں کا رواج ذرا کم تھا، اس لیے قیمتیں ذرا زیادہ تھیں۔"

میں نے کہا "کیا بہت پرانی ہے؟"

بولے "نہیں ایسی پرانی بھی نہیں ہوئی۔ میرا لڑکا اس پر کالج آیا جایا کرتا تھا اور اسے کالج چھوڑے ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے لیکن اتنا ضرور ہے کہ آج کل کی بائیسکلوں سے ذرا مختلف ہے۔ آجکل کی بائیسکلیں ٹین کی بنتی ہیں، جنہیں کالج کے سر پھرے لونڈے سستی سمجھ کر خرید لیتے ہیں۔ پرانی بائیسکلوں کے ڈھانچے مضبوط ہوا کرتے تھے۔"

"مگر مرزا پونے دو سو روپے تو میں ہرگز نہیں دے سکتا۔ اتنے روپے میرے پاس کہاں سے آئے۔ میں تو اس کی آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔"

مرزا کہنے لگے "تو میں تم سے پوری قیمت تھوڑی مانگتا ہوں۔ اول تو قیمت لینا نہیں چاہتا۔ لیکن ......"

میں نے کہا "نہ مرزا قیمت تو تمہیں لینی پڑے گی۔ اچھا تم یوں کرو ...... میں تمہاری جیب میں کچھ روپے ڈال دیتا ہوں، تم گھر جا کر گن لینا۔ اگر تمہیں منظور ہوئے تو کل بائیسکل بھیج دینا۔ اب یہاں بیٹھ کر تم سے سودا چکاؤں یہ تو کچھ دوکانداروں کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔"

مرزا بولے۔" بھئی جیسے تمھاری مرضی' میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ قیمت و میت جانے دو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم نہ مانو گے۔"

میں اٹھ کر اندر کمرے میں آیا۔ میں نے سوچا، استعمال شدہ چیز کی لوگ عام طور پر آدھی قیمت دیتے ہیں۔ لیکن جب میں نے مرزا سے کہا تھا کہ مرزا میں تو آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا تو مرزا اس پر معترض نہ ہوا تھا۔ وہ بیچارہ تو بلکہ یہی کہتا تھا کہ تم مفت ہی لے لو۔ لیکن مفت میں کیسے لے لوں۔ آخر بائیسکل ہے۔ ایک سواری ہے۔ فٹنوں اور گھوڑوں اور موٹروں اور ٹانگوں کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ بکس کو کھولا تو معلوم ہوا کہ ہست و بود کل چھیالیس روپے ہیں۔ چھیالیس روپے تو کچھ ٹھیک رقم نہیں' پینتالیس یا پچاس ہوں جب بھی بات ہے پچاس تو ہو نہیں سکتے۔ اور اگر پینتالیس ہی دینے ہیں تو چالیس کیوں نہ دیے جائیں جن رقموں کے آخر میں صفر آتا ہے وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول معلوم ہوتی ہیں۔ بس ٹھیک ہے۔ چالیس روپے دے دوں گا۔ خدا کرے مرزا قبول کر لے۔"

باہر آیا۔ چالیس روپے مٹھی میں بند کر کے میں نے مرزا کی جیب میں ڈال دیے اور کہا۔
"مرزا اس کو قیمت نہ سمجھنا۔ لیکن اگر ایک مفلس دوست کی حقیر سی رقم منظور کرنا تمہیں اپنی توہین معلوم نہ ہو تو کل بائیسکل بھجوا دینا۔"

مرزا چلنے لگے تو میں نے پھر کہا کہ مرزا کل ضرور صبح ہی صبح بھجوا دینا۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے پھر ایک دفعہ کہا۔" کل صبح آٹھ نو بجے تک پہنچ جائے دیر نہ کر دینا...... خدا حافظ ...... اور دیکھو مرزا میرے تھوڑے روپیوں کو بھی زیادہ سمجھنا ...... خدا حافظ ...... اور تمھارا بہت بہت شکریہ، میں تمھارا بہت ممنون ہوں اور میری گستاخی کو معاف کر دینا۔ دیکھو نہ کبھی کبھی یونہی بے تکلفی میں ...... کل صبح آٹھ نو بجے تک ...... ضرور ...... خدا حافظ۔"

مرزا کہنے لگے۔" ذرا اس کو جھاڑ پونچھ لینا اور تیل وغیرہ ڈال دینا، میرے نوکر کو فرصت ہوئی تو میں خود ہی ڈلوا دوں گا ورنہ تم ڈال دینا۔"

میں نے کہا۔" ہاں، ہاں وہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم کل بھیج ضرور دینا۔ اور دیکھنا آٹھ بجے تک یا ساڑھے سات بجے تک پہنچ جائے ...... اچھا ...... خدا حافظ!"

رات کو بستر پر لیٹا تو بائیسکل پر سیر کرنے کے مختلف پروگرام تجویز کرتا رہا۔ یہ ارادہ تو پختہ کر لیا کہ دو تین دن کے اندر اندر اردگرد کی تمام مشہور تاریخی عمارات اور کھنڈرات کو نئے سرے

سے دیکھ ڈالوں گا اس کے بعد اگلے گرمی کے موسم میں ہو سکا تو بائیسکل پر کشمیر وغیرہ کی سیر کروں گا۔ صبح صبح ہوا خوری کے لیے ہر روز نہر تک جایا کروں گا۔ شام کو ٹھنڈی سڑک پر جہاں اور لوگ سیر کو نکلیں گے، میں بھی صاف شفاف سطح پر ہلکے ہلکے، خاموشی کے ساتھ ہاتھی دانت کی ایک گیند کی مانند گزر جاؤں گا۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی روشنی بائیسکل کے چمکیلے حصّوں پر پڑے گی تو بائیسکل جگمگا اٹھے گی، اور ایسا معلوم ہوگا جیسے ایک راج ہنس زمین کے ساتھ ساتھ اڑ رہا ہے۔ وہ مسکراہٹ جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں ابھی تک میرے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی بار ہا دل چاہا کہ ابھی بھاگ کر جاؤں اور اسی وقت مرزا کو گلے لگاؤں۔

رات کو خواب میں دعائیں مانگتا رہا کہ خدایا مرزا بائیسکل دینے پر رضا مند ہو جائے۔

صبح اٹھا تو اٹھتے ہی نوکر نے یہ خوش خبری سنائی کہ "حضور وہ بائیسکل آگئی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اتنے سویرے؟"

نوکر نے کہا۔ "وہ تو رات ہی کو آگئی تھی۔ آپ سو گئے تھے۔ میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا اور ساتھ ہی مرزا صاحب کا آدمی ڈھبریاں کسنے کا ایک اوزار بھی دے گیا ہے۔"

میں حیران تو ہوا کہ مرزا صاحب نے سائیکل بھجوا دینے میں اس قدر عجلت سے کیوں کام لیا لیکن اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی نہایت شریف اور دیانت دار ہیں، روپے لے لیے تھے بائیسکل کیوں روک رکھتے۔

نوکر سے کہا۔ "دیکھو یہ اوزار یہیں چھوڑ جاؤ اور دیکھو بائیسکل کو کسی کپڑے سے خوب اچھی طرح جھاڑو اور موڑ پر جو بائیسکلوں والا بیٹھتا ہے اس سے جا کر بائیسکل میں ڈالنے کا تیل لے آؤ اور دیکھو! ابے بھاگا کہاں جا رہا ہے، ہم ضروری بات تم سے کہہ رہے ہیں۔ بائیسکل والے سے تیل کی ایک کپّی بھی لے آنا اور جہاں جہاں تیل دینے کی جگہ ہے وہاں تیل دیدینا اور بائیسکل والے سے کہنا کہ کوئی گھٹیا سا تیل نہ دیدے۔ جس سے تمام ہی پرزے خراب ہو جائیں، بائیسکل کے پرزے بڑے نازک ہوتے ہیں اور بائیسکل باہر نکال کر رکھو ہم ابھی کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ ذرا سیر کو جا رہے ہیں اور دیکھو صاف کر دینا اور زور زور سے کپڑا بھی مت رگڑنا بائیسکل کا پالش گھس جاتا ہے۔"

جلدی جلدی چائے پی، غسل خانے میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ "چل چل چنبیلی باغ میں" گاتا رہا۔ اس کے بعد کپڑے بدلے اوزار جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکلا۔

برآمدے میں آیا تو برآمدے کے ساتھ ہی ایک عجیب و غریب مشین نظر پڑی۔ ٹھیک طرح پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے۔ نوکر سے دریافت کیا۔

"کیوں بے یہ کیا چیز ہے؟"

نوکر بولا۔ "حضور یہ بائیسکل ہے۔"

میں نے کہا "بائیسکل؟ کس کی بائیسکل؟"

کہنے لگا۔ "مرزا صاحب نے بھجوائی ہے۔ آپ کے لیے۔"

میں نے کہا۔ "اور جو بائیسکل رات کو انھوں نے بھیجی تھی وہ کہاں گئی؟"

کہنے لگا۔ "یہی تو ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا بکتا ہے جو بائیسکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھیجی تھی وہ بائیسکل یہی ہے؟"

کہنے لگا۔ "جی ہاں۔"

میں نے کہا۔ "اچھا۔" اور پھر اسے دیکھنے لگا۔

"اس کو صاف کیوں نہیں کیا؟"

"حضور دو تین دفعہ صاف کیا ہے۔"

"تو یہ میلی کیوں ہے؟"

نوکر نے اس کا جواب دینا شاید مناسب خیال نہ کیا۔

"اور تیل لایا؟"

"ہاں حضور لایا ہوں۔"

"دیا؟"

"حضور وہ جو تیل دینے کے چھید ہوتے ہیں، وہ نہیں ملتے۔"

"کیا وجہ؟"

"حضور دھروں پہ میل اور زنگ جما ہے، وہ سوراخ کہیں بیچ ہی میں دب دبا گئے ہیں۔"

رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا۔ اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا تو اتنا تو ثابت ہو گیا کہ بائیسکل ہے۔ لیکن مجمل ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ ہل اور رہٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی اور جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پہیے کو گھما گھما کر وہ سوراخ

تلاش کیا جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا۔ لیکن اب سوراخ میں سے آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا۔ چنانچہ نوکر بولا۔ "حضور وہ تیل تو سب اِدھر اُدھر بہہ جاتا ہے، بیچ میں تو جاتا ہی نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا اوپر اوپر ہی ڈال دو یہ بھی مفید ہوتا ہے۔"

آخرکار بائیسکل پر سوار ہوا، پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے۔ گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی اُترائی تھی اس پر بائیسکل خود بخود چلنے لگی۔ لیکن اس رفتار سے جیسے تارکول زمین پر بہتا ہے اور ساتھ ہی مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونی شروع ہوئیں۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے۔ چیں چاں چوں کی قسم کی آوازیں زیادہ تر گدّی کے نیچے اور پچھلے پہیئے سے نکلتی تھیں۔ کھٹ کھڑ کھڑ کے قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھیں۔ چر۔ چرخ۔ چر۔ چرخ کی قسم کے سُر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔ زنجیر ڈھیلی ڈھیلی تھی۔ میں جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا تھا زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی، جس سے وہ تن جاتی تھی اور چڑ چڑ بولنے لگتی تھی اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی پچھلا پہیہ گھومنے کے علاوہ جھومتا بھی تھا۔ یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنے کو بھی حرکت کرتا تھا۔ چنانچہ سڑک پر جو نشان پڑتا جاتا تھا اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔ مڈگارڈ تھے تو سہی لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے۔ ان کا فائدہ صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو مڈگارڈوں کی بدولت ٹائر دھوپ سے بچے رہیں گے۔ اگلے پہیئے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ لمحہ بھر کو زرا سے اوپر اٹھ جاتا تھا اور میرا سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مُکّے مارے جا رہا ہو۔ پچھلے اور اگلے پہیئے کو چوں چوں پھٹ۔ چوں چوں پھٹ۔ چوں چوں پھٹ کی صدا نکل رہی تھی۔ جب اتار پر بائیسکل ذرا تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آگیا اور بائیسکل کے کئی اور پرزے جو اب تک سو رہے تھے بیدار ہو کر گویا ہوئے۔ اِدھر اُدھر کے لوگ چونکے، ماؤں نے اپنے بچوں کو سینوں سے لگا لیا۔ کھڑ کھڑ کے بیچ میں پہیوں کی آواز جدا سنائی دے رہی تھی لیکن چونکہ بائیسکل اب پہلے سے تیز تھی اس لیے چوں چوں پھٹ چوں چوں پھٹ کی آواز نے چوں پھٹ، چوں پھٹ، چوں پھٹ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تمام بائیسکل کسی ادق افریقی زبان کی گردانیں دہرا رہی تھی۔

اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پر گراں گزری چنانچہ اس میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہو گئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مُڑ گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جا تو سامنے کو رہا تھا، لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتہً چھ انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لئے میں ٹانگیں اوپر نیچے کر رہا تھا تو میرے گھٹنے میری ٹھوڑی تک پہنچ جاتے تھے۔ کمر دُہری ہو کر باہر کو نکلی ہوئی تھی اور ساتھ ہی اگلے پہیوں کی اٹکھیلیوں کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔

گدی کا نیچے ہو جانا از حد تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اس لیے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کو ٹھیک کر لوں، چنانچہ میں نے بائیسکل کو ٹھہرا لیا اور نیچے اتر آکر بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یک لخت دنیا میں ایک خاموشی سی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی ریل اسٹیشن سے نکل کر باہر آ گیا ہوں۔ جیب سے میں نے اوزار نکالا۔ گدی کو اونچا کیا۔ کچھ ہینڈل کو ٹھیک کیا اور دوبارہ سوار ہوا۔

دس قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اب کے ہینڈل یک لخت نیچا ہو گیا۔ اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی۔ میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا۔ تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھے تھے اور برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کو تصور کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ میں دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔ مجھے اس مشابہت کا احساس بہت تیز تھا جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں دائیں بائیں لوگوں کو کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا، یوں تو ہر شخص میل بھر پہلے ہی سے مڑ مڑ کر دیکھنے لگتا تھا لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے لیے میری مصیبت ضیافت طبع کا باعث نہ ہو۔

ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گدی بھی پھر نیچی ہو گئی اور میں ہمہ تن زمین کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لڑکے نے کہا۔ "دیکھو یہ آدمی کیا کر رہا ہے"۔ گویا اس بدتمیز کے نزدیک میں کوئی کرتب دکھا رہا تھا۔ میں نے اتر کر پھر ہینڈل اور گدی کو اونچا کیا۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک نہ ایک پھر نیچا ہو جاتا۔ وہ لمحے جن کے دوران میں میرے ہاتھ اور میرا جسم دونوں برابر ایک ہی بلندی پر واقع ہوں، بہت ہی کم تھے اور ان میں بھی میں یہی سوچتا رہتا تھا کہ اب کے گدی پہلے بیٹھے گی یا ہینڈل۔ لیکن اس سے ہینڈل پر اتنا بوجھ پڑ جاتا کہ وہ نیچا ہو جاتا۔

جب دو میل گزر گئے اور بائیسکل کی اٹھک بیٹھک نے ایک مقرر باقاعدگی اختیار کر لی تو فیصلہ کیا کہ کسی مستری سے پیچ کسوا لینے چاہئیں۔ چنانچہ بائیسکل کو ایک دوکان پر لے گیا۔

بائیسکل کی کھڑکھڑ سے جتنے لوگ کام کر رہے تھے سب کے سب سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے۔ لیکن میں نے جی کڑا کر کے کہا۔ "ذرا اس کی مرمّت کر دیجیے۔"

ایک مستری آگے بڑھا، لوہے کی ایک سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی جس سے اس نے مختلف حصوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ ٹھوک بجا کر دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے بڑی تیزی کے ساتھ سب حالات کا اندازہ لگا لیا ہے۔ لیکن پھر بھی مجھ سے پوچھنے لگا۔ "کس کس پرزے کی مرمّت کرائیے گا؟"

میں نے کہا۔ "بڑے گستاخ ہو تم، دیکھتے نہیں کہ صرف ہینڈل اور گدّی کو ذرا اونچا کروا کے کسوانا ہے۔ بس اور کیا؟ ان کو مہربانی کر کے فوراً ٹھیک کر دو اور بتاؤ کتنے پیسے ہوئے؟"

مستری کہنے لگا۔ "مڈگارڈ بھی ٹھیک نہ کر دوں؟"

میں نے کہا۔ "ہاں، وہ بھی ٹھیک کر دو۔"

کہنے لگا۔ "اگر باقی چیزیں بھی ٹھیک کرا لیں تو اچھا ہو۔"

میں نے کہا۔ "اچھا کر دو۔"

بولا۔ "یوں تھوڑی ہو سکتا ہے۔ دس پندرہ دن کا کام ہے۔ آپ اسے ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔"

"اور پیسے کتنے لو گے؟"

کہنے لگا۔ "بس تیس چالیس لگیں گے۔"

ہم نے کہا۔ "بس جی، جو کام تم سے کہا ہے کرو۔ اور باقی ہمارے معاملات میں دخل مت دو۔"

تھوڑی دیر میں ہینڈل اور گدّی پھر اونچی کر کے کس دی گئی۔ میں چلنے لگا تو مستری نے کہا۔ "میں نے کس تو دیا ہے لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں، ابھی تھوڑی دیر میں پھر ڈھیلے ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ہیں بدتمیز کہیں کا۔ تو دو آنے پیسے مفت میں لے لیے؟"

بولا۔ "جناب آپ کو بائیسکل بھی تو مفت ملی ہوگی۔ یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی

ہے نا؟ ـــــ للّو یہ وہی بائیسکل ہے جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے، پہچانی تم نے؟ بھئی صدیاں ہی گزر گئیں لیکن اس بائیسکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی۔"

میں نے کہا "واہ مرزا صاحب کے لڑکے اس پر کالج آیا جایا کرتے تھے اور ان کو ابھی کالج چھوڑے دو سال بھی نہیں ہوئے۔"

مستری نے کہا۔" ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن مرزا صاحب خود جب کالج میں پڑھتے تھے تو اُن کے پاس بھی تو یہی بائیسکل تھی۔"

میری طبیعت یہ سن کر کچھ مردہ سی ہوگئی۔ میں بائیسکل کو ساتھ لیے آہستہ آہستہ پیدل چل پڑا لیکن پیدل چلنا بھی مشکل تھا۔ اس بائیسکل کے چلانے میں ایسے ایسے پٹھوں پر زور پڑتا تھا جو عام بائیسکلوں کے چلانے میں استعمال نہیں ہوتے۔ اس لیے ٹانگوں اور کندھوں اور کمر اور بازوؤں میں جا بجا درد ہو رہا تھا۔ مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا لیکن ہر بار کوشش کر کے اسے دل سے ہٹا دیتا تھا ورنہ میں پاگل ہو جاتا اور جنون کی حالت میں پہلی حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوتی کہ مرزا کے مکان کے سامنے بازار میں ایک جلسہ منعقد کرتا جس میں مرزا کی مکاری، بے ایمانی اور دغابازی پر ایک طویل تقریر کرتا، کل بنی نوع انسان اور آیندہ آنے والی نسلوں کو مرزا کی ناپاک فطرت سے آگاہ کر دیتا اور اس کے بعد ایک چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مر جاتا۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جس طرح ہو سکے اب بائیسکل کو اونے پونے داموں بیچ کر جو وصول ہو اسی پر صبر و شکر کروں، بلا سے دس پندرہ روپے کا خسارہ سہی چالیس کے چالیس روپے تو ضائع نہ ہوں گے۔ راستے میں بائیسکلوں کی ایک اور دوکان آئی وہاں ٹھہر گیا۔

دوکان دار بڑھ کر میرے پاس آیا لیکن میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا تھا عمر بھر کبھی کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں۔ آخر بڑے سوچ بچار اور بڑے تامل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ "یہ بائیسکل ہے۔"

دوکان دار کہنے لگا۔" پھر۔"

میں نے کہا۔" لوگے؟"

کہنے لگا۔" کیا مطلب؟"

میں نے کہا۔" بیچتے ہیں ہم۔"

دوکان دار نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ پھر مجھے دیکھا، پھر بائیسکل کو دیکھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا، آدمی کون سا ہے اور بائیسکل کون سی ہے۔ آخر کار بولا۔ "کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر؟"

ایسے سوالوں کا خدا جانے کیا جواب ہوتا ہے۔ میں نے کہا ۔ "کیا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کر جو روپے مجھے وصول ہوں گے، ان کا مصرف کیا ہوگا؟"

کہنے لگا۔ "وہ تو ٹھیک ہے مگر کوئی اس کو لے کر کرے گا کیا؟"

میں نے کہا۔ "اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا۔"

کہنے لگا۔ "اچھا! چڑھ گیا۔ پھر؟"

میں نے کہا۔ "پھر کیا؟ پھر چلائے گا اور کیا؟"

دوکان دار بولا۔ "اچھا! ہوں۔ خدا بخش ذرا یہاں آنا۔ یہ بائیکل بکنے آئی ہے۔"

جن حضرت کا اسم گرامی خدا بخش تھا، انھوں نے بائیسکل کو دور ہی سے یوں دیکھا جیسے بُو سونگھ رہے ہوں۔

اس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا، آخر میں وہ جن کا نام خدا بخش نہیں تھا میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ "تو آپ سچ مچ بیچ رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "تو اور کیا محض آپ سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لیے میں گھر سے یہ بہانہ گھڑ کر لایا تھا؟"

کہنے لگا۔ "تو کیا لیں گے آپ؟"

میں نے کہا۔ "تمہیں بتاؤ۔"

کہنے لگا۔ "سچ سچ بتاؤں؟"

میں نے کہا۔ "ہاں۔"

پھر کہنے لگا۔ "سچ سچ بتاؤں؟"

میں نے کہا۔ "اب بتاؤ گے بھی یا یوں ہی ترساتے رہو گے؟"

کہنے لگا۔ "تین روپے دوں گا، اس کے۔"

میرا خون کھول اٹھا۔ اور میرے ہاتھ پاؤں اور ہونٹ غصے کے مارے کانپنے لگے۔

میں نے کہا:

"او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے نچلے طبقے کے انسان مجھے اپنی توہین کی پروا نہیں، لیکن تو نے اپنی بیہودہ گفتاری سے اس بے زبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے، اس کے لیے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا۔" یہ کہہ کر میں بائیسکل پر سوار ہو گیا اور اندھا دھند پاؤں چلانے لگا۔

مشکل سے بیس قدم گیا ہوں گا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے زمین یک لخت اچھل کر مجھ سے آلگی ہے، آسمان میرے سر پر سے ہٹ کر میری ٹانگوں کے بیچ میں سے گزر گیا اور ادھر اُدھر کی عمارتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی جگہ بدل لی ہے۔ حواس بجا ہوئے تو معلوم ہوا، میں زمین پر بے تکلفی سے بیٹھا ہوں، گویا بڑی مدت سے مجھے اس بات کا شوق تھا جو آج پورا ہوا! اِرد گرد کچھ لوگ جمع تھے، جن میں سے اکثر ہنس رہے تھے۔ سامنے وہ دوکان تھی جہاں ابھی میں نے اپنی ناکام گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کیا تھا۔ میں نے اپنے گرد و پیش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میری بائیسکل کا اگلا پہیہ بالکل الگ ہو کر لڑھکتا ہوا سڑک کے پار جا پہنچا ہے، اور باقی بائیسکل میرے پاس پڑی ہے۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔ جو پہیہ الگ ہو گیا تھا اس کو ہاتھ میں اٹھایا۔ دوسرے ہاتھ میں باقی ماندہ بائیسکل کو تھاما اور چل کھڑا ہوا۔ یہ محض ایک اضطراری حرکت تھی ورنہ حاشا وکلّا وہ بائیسکل مجھے ہرگز اتنی عزیز نہ تھی کہ میں اس کو اس حالت میں ساتھ ساتھ لیے پھرتا۔

جب میں یہ سب کچھ اٹھا کر چل دیا تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ یہ تم کیا کر رہے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ تمہارا ارادہ کیا ہے؟ یہ دو پہیے کاہے کو لے جا رہے ہو؟

سب سوالوں کا جواب یہی ملا کر دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم یہاں سے چل دو۔ سب لوگ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ سر اونچا رکھو اور چلتے جاؤ۔ جو ہنس رہے ہیں انھیں ہنسنے دو۔ اس قسم کے بیہودہ لوگ ہر قوم اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں آخر ہوا کیا؟ محض ایک حادثہ! بس دائیں بائیں مت دیکھو چلتے جاؤ۔

لوگوں کے ناشائستہ کلمات بھی سنائی دے رہے تھے۔ ایک آواز آئی "بس حضرت غصہ تھوک ڈالیے۔" ایک دوسرے صاحب بولے۔ "بے حیا بائیسکل گھر پہنچ کر تجھے مزہ چکھاؤں گا۔" ایک والد اپنے لخت جگر کی انگلی پکڑے جا رہے تھے۔ میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے۔ "دیکھا بیٹا یہ سرکس کی بائیسکل ہے، اس کے دونوں پہیے الگ الگ ہوتے ہیں۔"

لیکن میں چلتا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں آبادی سے دور نکل گیا۔ اب میری رفتار میں ایک عزیمت پائی جاتی تھی۔ میرا دل جو کئی گھنٹوں سے ایک کشمکش میں پیچ وتاب کھا رہا تھا، اب بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ میں چلتا گیا۔ حتیٰ کہ دریا پر جا پہنچا۔ پل کے اوپر کھڑے ہو کر میں نے دونوں پہیوں کو ایک ایک کر کے اس بے پروائی کے ساتھ دریا میں پھینک دیا جیسے کوئی لیٹر بکس میں خط ڈالتا ہے اور واپس شہر کو روانہ ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کے گھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ مرزا بولے "اندر آجاؤ۔"

میں نے کہا "آپ ذرا باہر تشریف لایئے۔ میں آپ جیسے خدا رسیدہ بزرگ کے گھر میں وضو کیے بغیر کیسے داخل ہو سکتا ہوں۔"

مرزا باہر تشریف لائے تو میں نے وہ اوزار ان کی خدمت میں پیش کیا، جو انہوں نے بائیسکل کے ساتھ ہی مفت مجھ کو عنایت فرمایا تھا۔ اور کہا:

مرزا صاحب آپ ہی اس اوزار سے شوق فرمایا کیجیے۔ میں اب اس سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔"

گھر پہنچ کر میں نے پھر علم کیمیا کی اس کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا جو میں نے ایف۔ اے میں پڑھی تھی۔

پریم چند

گلی ڈنڈا

میرے ہم جولیوں میں ایک لڑکا گیا نام کا تھا۔ مجھ سے دو تین سال بڑا ہوگا۔ دُبلا لمبا بندروں کی پھرتی۔ بندروں کی سی لمبی لمبی انگلیاں۔ بندروں کی سی جھپٹ۔ گلی کیسی ہی ہو، اس طرح لپکتا تھا جس طرح چھپکلی کیڑوں پر لپکتی ہے۔ معلوم نہیں اس کے ماں باپ کون تھے، کہاں رہتا تھا، کیا کھاتا تھا، پر تھا ہمارا گلی کلب کا چیمپین، جس کی طرف وہ آجائے اس کی جیت یقینی تھی۔ ہم سب اسے دُور سے آتا دیکھ کر اس کا استقبال کرتے تھے اور اسے اپنا گوئیاں بنا لیتے تھے۔

ایک دن ہم اور گیا دو ہی کھیل رہے تھے، وہ پدا رہا تھا اور میں پد رہا تھا لیکن عجیب بات ہے کہ پدانے میں ہم دن بھر مست رہ سکتے ہیں۔ پدنا ایک منٹ کا بھی سہا نہیں جاتا۔ میں نے گلا چھڑانے کے لیے وہ سب چالیں چلیں جو ایسے موقع پر خلاف قانون ہوتے ہوئے بھی قابل معافی ہیں لیکن گیا اپنا داؤں لیے بغیر میرا پیچھا نہ چھوڑتا تھا، میں گھر کی طرف بھاگا خوشامد کا کوئی اثر نہ ہوا۔ گیا نے مجھے دوڑ کر پکڑ لیا اور ڈنڈا تان کر بولا "میرا داؤں دے کر جاؤ۔ پدایا تو بڑے بہادر بن کر پدنے کے وقت کیوں بھاگے جاتے ہو؟"

"تم پھر پداؤ تو میں دن بھر پدتا رہوں گا، نہ کھانے جاؤں نہ پینے؟"

"ہاں میرا داؤں دیے بغیر کہیں نہیں جا سکتے۔"

"میں تمہارا غلام ہوں؟"

"ہاں تم میرے غلام ہو۔"

"میں گھر جاتا ہوں، دیکھوں تم میرا کیا کر لو گے؟"

"گھر کیسے جاؤ گے۔ دل لگی ہے۔ داؤں دیا ہے داؤں لیں گے۔"

"اچھا کل تمہیں میں نے امرود کھلایا تھا وہ رکھ دو۔"

"وہ تو پیٹ میں چلا گیا۔"

"نکالو پیٹ سے۔ تم نے کیوں کھایا میرا امرود؟"

"امرود تو تم نے دیا، تب میں نے کھایا۔ میں تم سے مانگنے گیا تھا؟"

"جب تک میرا امرود نہ دو گے۔ میں داؤں نہ دوں گا۔"

میں سمجھتا تھا کہ انصاف میری طرف ہے۔ آخر میں نے کسی غرض کے لیے ہی اسے امرود کھلایا ہوگا۔ کون کسی کے ساتھ بے غرضانہ سلوک کرتا ہے۔

گیا نے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا "میرا داؤں دے کر جاؤ۔ امرود سمرود میں نہیں جانتا۔"

مجھے انصاف کا زور تھا، ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے جانے نہ دیتا تھا۔ میں نے گالی دی۔

اس نے اس سے بھی سخت گالی دی اور گالی ہی نہیں، ایک چانٹا جما دیا۔ میں نے اسے دانت سے کاٹ لیا۔ اس نے میری پیٹھ پر ڈنڈا جما دیا۔ میں رونے لگا۔

گیا میرے اس ہتھیار کا مقابلہ نہ کر سکا۔ بھاگا۔ میں نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے۔ ڈنڈے کی چوٹ بھول گیا۔ اور ہنستا ہوا گھر پہنچا۔ میں تھانے دار کا لڑکا ایک نیچ ذات کے لونڈے کے ہاتھوں پٹ گیا۔ مجھے اس وقت بھی یہ بے عزتی کا باعث معلوم ہوا۔ لیکن گھر میں کسی سے شکایت نہ کی۔

ان ہی دنوں والد صاحب کا وہاں سے تبادلہ ہو گیا۔ میں نئی دنیا دیکھنے کی خوشی میں ایسا پھولا کہ اپنے ہم جولیوں سے جدا ہونے کا بالکل افسوس نہ ہوا۔ والد صاحب افسوس کرتے تھے۔ یہ بڑی آمدنی کی جگہ تھی۔ اماں بھی بہت افسوس کرتی تھیں۔ یہاں سب چیزیں سستی تھیں اور محلے کی عورتوں سے لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ لیکن میں مارے خوشی کے پھولا نہیں سماتا تھا۔ لڑکوں سے شیخی بگھار رہا تھا "وہاں ایسے گھر تھوڑے ہی ہوتے ہیں، ایسے ایسے اونچے مکان ہیں کہ آسمان سے باتیں کرتے ہیں؛ وہاں کے انگریزی اسکولوں میں کوئی ماسٹر لڑکوں کو پیٹے تو قید ہو جائے۔" میرے دوستوں کی حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھیں اور متعجب چہرے صاف بتلا رہے تھے کہ میں ان کی نگاہوں میں کتنا اونچا اٹھ گیا ہوں بچوں میں جھوٹ کو سچ بنا لینے کی وہ طاقت ہوتی ہے جسے ہم جو سچ کو جھوٹا بنا دیتے ہیں نہیں سمجھ سکتے۔ دوست

کہہ رہے تھے کہ تم خوش قسمت ہو بھائی۔ ہمیں تو اس گاؤں میں جینا بھی ہے اور مرنا بھی ہے۔

بیس سال گزر گئے۔ میں نے انجنیئری پاس کی اور کسی ضلع کا دورہ کرتے ہوئے اسی قصبے میں پہنچا اور ڈاک بنگلے میں ٹھیرا۔ اس جگہ کو دیکھتے ہی بچپن کی اس قدر دل کش اور شیریں یاد تازہ ہو اٹھی کہ میں نے چھڑی اٹھائی اور قصبے کی سیر کو نکلا۔ آنکھیں کسی پیاسے مسافر کی طرح بچپن کے ان مقامات کو دیکھنے کے لیے بیتاب تھیں جن کے ساتھ کتنی ہی یادگاریں وابستہ تھیں لیکن اس مانوس نام کے علاوہ کوئی شناسا نہ ملا۔ جہاں کھنڈر تھا وہاں پکے مکان کھڑے تھے۔ جہاں برگد کا ایک پرانا درخت تھا وہاں اب ایک خوبصورت باغیچہ تھا۔ اس جگہ کی کایا پلٹ ہو گئی تھی۔ اگر اس کے نام و نشان کا علم نہ ہوتا تو میں اسے پہچان بھی نہ سکتا۔ وہ پرانی یادگاریں باہیں پھیلا پھیلا کر اپنے پرانے دوستوں کے گلے لپٹنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھیں۔ مگر وہ دنیا بدل گئی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اس زمین سے لپٹ کر روؤں اور کہوں کہ تم مجھے بھول گئیں لیکن میرے دل میں تمہاری یاد تازہ ہے۔

اچانک ایک کھلی جگہ میں میں نے دو تین لڑکوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے میں اپنے آپ کو بھول گیا کہ میں ایک اونچا افسر ہوں۔ صاحبی ٹھاٹھ میں رعب اور اختیار کے لباس میں جا کر ایک لڑکے سے پوچھا۔ "کیوں بیٹے یہاں کوئی گیا نام کا آدمی رہتا ہے؟"

ایک لڑکے نے گلی ڈنڈا اسمیٹ کر سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کون گیا؟ گیا چمار؟"

میں نے یوں ہی کہا۔ "ہاں ہاں وہی۔ گیا نام کا کوئی آدمی ہے تو شاید وہی ہو"

"ہاں ہے تو۔"

"ذرا اسے بلا سکتے ہو؟"

لڑکا دوڑا ہوا گیا اور جلد ایک پانچ ہاتھ کے کالے دیو کو ساتھ لیے آتا دکھائی دیا۔ میں نے دور ہی سے پہچان لیا۔ اس کی طرف لپکنا چاہتا ہی تھا کہ اس کے گلے سے لپٹ جاؤں مگر کچھ سوچ کر رہ گیا۔

بولا۔ "کہو گیا مجھے پہچانتے ہو؟"

گیا نے مجھے جھک کر سلام کیا۔ "ہاں مالک بھلا پہچانوں گا نہیں، آپ مزے میں رہے؟"

"بہت مزے میں، تم اپنی کہو۔"

"ڈپٹی صاحب کا سائیس ہوں۔"

"ماتا، موہن، درگا سب کہاں ہیں کچھ خبر ہے۔"

"ماتا تو مر گیا۔ موہن اور درگا دونوں ڈاکیے ہو گئے ہیں اور آپ۔"

"میں ضلع کا انجینیر ہوں۔"

"سرکار تو پہلے ہی بڑے جہین (ذہین) تھے۔"

"اب بھی گلی ڈنڈا کھیلتے ہو؟" میں نے گیا کی طرف سوال کی آنکھوں سے دیکھا۔

"گلی ڈنڈا کیا کھیلوں سرکار، اب تو پیٹ کے دھندے ہی سے چھٹی نہیں ملتی۔"

"آؤ آج ہم تم کھیلیں۔ تم پدانا۔ ہم پدیں گے تمھارا ایک داؤں ہمارے اوپر ہے۔ وہ آج لے لو۔"

ہم بستی سے کوئی تین میل نکل آئے تھے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ مغرب کی طرف کوسوں تک بھیم تال پھیلا ہوا تھا، جہاں آکر کسی وقت پھول توڑنے جاتے تھے اور اس کے جھمکے بنا کر کانوں میں ڈال لیتے تھے۔ جون کی شام کیسر میں ڈوبی چلی آرہی تھی۔ میں لپک کر درخت پر چڑھ گیا اور شاخ کاٹ لایا جھٹ پٹ گلی ڈنڈا بن گیا۔ کھیل شروع ہو گیا۔ میں نے داب میں گلی رکھ کر اچھالی۔ گلی گیا کے سامنے سے نکل گئی۔

اس نے ہاتھ لپکایا جیسے مچھلی پکڑ رہا ہو۔ گلی اس کے پیچھے جا کر گری۔ یہ وہی گیا تھا جس کے ہاتھوں میں گلی جیسے آپ ہی آپ جا کر بیٹھ جاتی تھی۔ وہ داہنے بائیں کہیں ہو گلی اس کی ہتھیلی ہی میں پہنچتی تھی جیسے گلیوں پر اس نے جادو کر کے انھیں بس میں کر لیا ہو۔ نئی گلی، پرانی گلی، چھوٹی گلی، بڑی گلی، نوکدار گلی سبھی اس سے ہل جاتی تھیں۔

آدھ گھنٹہ پدانے کے بعد گلی ایک بار ڈنڈے میں آلگی۔ میں نے دھاندلی کی۔ "گلی ڈنڈے میں نہیں لگی بالکل پاس سے گئی۔ لیکن لگی نہیں۔"

گیا نے کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہ کیا۔ "نہ لگی ہو گی۔"

"ڈنڈے میں لگتی تو کیا میں بے ایمانی کرتا؟"

"نہیں بھیا، تم بھلا بے ایمانی کرو گے!"

بچپن میں مجال تھی میں ایسا گھپلا کر کے جیتا بچتا۔ یہی گیا میری گردن پر چڑھ بیٹھتا۔ لیکن آج میں اسے کتنی آسانی سے دھوکہ دیے چلا جاتا تھا۔ گدھا ہے ساری باتیں بھول گیا۔

اب کے گلی ڈنڈے میں لگی اور اتنے زور سے لگی جیسے بندوق چھوٹی ہو۔ اس ثبوت کے مقابل اب کسی طرح کا فریب چلنے کا مجھے اس وقت بھی حوصلہ نہ ہو سکا لیکن کیوں نہ ایک بار سچ کو جھوٹ بنانے کی کوشش کروں۔ میرا ہرج ہی کیا ہے۔ مان گیا تو واہ واہ۔ ورنہ دو چار ہاتھ پدنا ہی تو پڑے گا۔ اندھیرے کا بہانہ کر کے گلا چھڑاؤں گا۔ پھر کون داؤں دینے آتا ہے۔ گیا نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

"لگ گئی۔ ٹن سے بولی۔"

میں نے انجان بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے لگتے دیکھا۔ میں نے تو نہیں دیکھا۔"

"ٹن سے بولی ہے سرکار۔"

"اینٹ میں لگ گئی ہوگی۔" —— میرے منہ سے یہ فقرہ کیسے اس وقت نکل گیا۔ اس پر مجھے خود حیرت ہے۔ اس سچائی کا جھٹلانا ویسا ہی تھا جیسے دن کو رات کہنا۔ ہم دونوں نے گلی کو ڈنڈے میں زور سے لگتے دیکھا تھا لیکن گیا نے میرا کہنا مان لیا۔

"ہاں سرکار کسی اینٹ میں لگی ہوگی۔ ڈنڈے میں لگتی تو آواز نہ آتی۔"

میں نے پھر پدانا شروع کیا لیکن اس قدر صاف اور صریح دھوکا دینے کے بعد گیا کی سادگی پر مجھے رحم آنے لگا۔ اس لیے جب تیسری بار گلی ڈنڈے میں لگی تو میں نے بڑی فراخ دلی سے داؤں دینا طے کر لیا۔

گیا نے کہا "اب تو اندھیرا ہو گیا ہے بھیا۔ کل پر رکھو۔"

میں نے سوچا کل بہت سا وقت ہو گا یہ نہ جانے کتنی دیر پدائے اس لیے معاملہ صاف کر لینا اچھا ہو گا۔

"نہیں نہیں بہت اُجالا ہے۔ تم اپنا داؤں لے لو۔"

"گلی سوجھے گی نہیں۔"

"کچھ پرواہ نہیں۔"

گیا نے پدانا شروع کیا لیکن اب اسے بالکل مشق نہ تھی۔ اس نے دوبارہ ٹل لگانے کا ارادہ کیا لیکن دونوں ہی بار چوک گیا۔ ایک منٹ سے کم میں وہ اپنا داؤں پورا کر چکا تھا۔ بیچارہ گھنٹہ بھر پدا۔ لیکن ایک منٹ میں اپنا داؤں کھو بیٹھا۔ میں نے اپنے دل کی وسعت کا ثبوت دیا" ایک داؤں اور لے لو۔ تم پہلے ہی ہاتھ میں نیچ گئے۔"

"نہیں بھیا، اب اندھیرا ہو گیا ہے۔"

"تمہاری مشق چھوٹ گئی کیا؟ کبھی کھیلتے نہیں ہو؟"

"کھیلنے کا وقت ہی کہاں ملتا ہے بھیا۔"

ہم دونوں موٹر میں جا بیٹھے اور چراغ جلتے جلتے پڑاؤ پر جا پہنچے۔ گیا چلتے چلتے بولا۔ "کل یہاں گلی ڈنڈا ہوگا۔ سبھی پرانے کھلاڑی کھیلیں گے۔ تم بھی آؤ۔ جب تمہیں فرصت ہو۔ سبھی کھلاڑیوں کو بلالوں۔"

میں نے شام کا وقت دیا۔ اور دوسرے دن میچ دیکھنے گیا۔ کوئی دس آدمیوں کی منڈلی تھی۔ کئی میرے لڑکپن کے ساتھی نکلے مگر بیشتر جوان تھے جنہیں میں پہچان نہ سکا۔ کھیل شروع ہوا۔ میں موٹر میں بیٹھا بیٹھا تماشا دیکھنے لگا۔ آج گیا کا کھیل اور اس کی کرامات دیکھ کر دنگ رہ گیا وہ ٹل لگاتا تو گلی آسمان سے باتیں کرتی کل سی وہ جھجھک وہ ہچکچاہٹ، وہ بے دلی آج نہ تھی۔ لڑکپن کی جو بات تھی آج اس نے کمال کی معراج تک پہنچا دی تھی۔ کہیں کل اس نے مجھے پدایا ہوتا تو میں ضرور رونے لگتا۔ اس کے ڈنڈے کی چوٹ کھا کر گلی دو سو گز کی خبر لاتی تھی۔

پدانے والوں میں ایک نوجوان نے کچھ بے عنوانی کی اس کا دعویٰ تھا کہ میں نے گلی دبوچ لی ہے۔ گیا کا کہنا تھا کہ لگ کر اچھلی ہے۔ اس پر دونوں میں تال ٹھوکنے کی نوبت آئی۔ نوجوان دب گیا۔ گیا کا تمتماتا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ میں کھیل میں نہ تھا مگر دوسروں کے اس کھیل میں مجھے وہی لڑکپن کا لطف آرہا تھا۔ جب ہم سب کچھ بھول کر کھیل میں مست ہو جاتے تھے۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ گیا کل میرے ساتھ کھیلا نہیں کھیلنے کا بہانہ کیا۔ اس نے مجھے رحم کے قابل سمجھا میں نے دھاندلی کی۔ بے ایمانیاں کیں اُسے ذرا بھی غصہ نہ آیا اس لیے کہ وہ کھیل نہ رہا تھا۔ مجھے کھلا رہا تھا۔ میرا جی دیکھ رہا تھا۔ وہ پدا کر میرا کچومر نکالنا نہیں چاہتا تھا۔ اب میں افسر ہوں۔ یہ افسری میرے اور اس کے درمیان اب دیوار بن گئی ہے۔ میں اب اس کا لحاظ پا سکتا

ہوں۔ ادب پا سکتا ہوں لیکن اس کا ہم جولی نہیں بن سکتا۔ لڑکپن کھا تب میں اس کا ساتھی تھا۔ ہم میں کوئی بھید نہ تھا۔ یہ عہدہ پاکر اب میں اس کے رحم کے قابل ہوں اور وہ اب مجھے اپنا جوڑا نہیں سمجھتا۔ وہ بڑا ہو گیا ہے میں چھوٹا ہو گیا ہوں۔

ابوالکلام آزاد

قولِ فیصل

تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی حکمراں طاقتوں نے آزادی اور حق کے مقابلے میں ہتھیار اٹھائے ہیں تو عدالت گاہوں نے سب سے زیادہ آسان اور بے خطا ہتھیار کا کام دیا ہے۔ عدالت کا اختیار ایک طاقت ہے اور وہ انصاف و ناانصافی دونوں کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے۔ منصف گورنمنٹ کے ہاتھ میں وہ عدل وحق کا سب سے بہتر ذریعہ ہے۔ لیکن جابر اور ظالم حکومتوں کے لیے اس سے بڑھ کر انتقام اور ناانصافی کا کوئی آلہ بھی نہیں۔

تاریخ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں میدان جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں میں ہی ہوتی ہیں، دُنیا کے بانیانِ مذاہب سے لے کر سائنس کے محققین تک کوئی پاک اور حق پسند جماعت نہیں ہے جو مجرموں کی طرح عدالت کے سامنے کھڑی نہ کی گئی ہو۔ بلاشبہ زمانہ کے انقلاب سے عہدِ قدیم کی بہت سی برائیاں مٹ گئیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اب دنیا میں دوسری عیسوی کی خوفناک رومی عدالتیں اور ازمنۂ متوسط کی پراسرار "انکویزیشن" وجود نہیں رکھتی۔ لیکن میں ماننے کے لئے تیار نہیں کہ جو جذبات ان عدالتوں میں کام کرتے تھے ان سے بھی ہمارے زمانے کو نجات مل گئی ہے۔ وہ عمارتیں ضرور گرادی گئیں جن کے اندر خوفناک اسرار بند تھے۔ لیکن دلوں کو کون بدل سکتا ہے جو انسانی خود غرضی اور ناانصافی کے خوفناک رازوں کا دفینہ ہیں؟

عدالت کی ناانصافیوں کی فہرست بڑی ہی طولانی ہے۔ تاریخ آج تک اس کے ماتم سے فارغ نہ ہوسکی۔ ہم اس میں حضرت مسیح جیسے پاک انسان کو دیکھتے ہیں جو اپنے عہد کی اجنبی عدالت کے سامنے چوروں کے ساتھ کھڑے کیے گئے۔ ہم کو اس میں

سقراط نظر آتا ہے جس کو صرف اس لیے زہر کا پیالہ پینا پڑا کہ وہ اپنے ملک کا سب سے زیادہ سچا انسان تھا۔ ہم کو اس میں گلیلیو کا نام ملتا ہے، جو اپنی معلومات اور مشاہدات کو اس لیے جھٹلا نہ سکا کہ وقت کی عدالت کے نزدیک ان کا اظہار جرم ہے۔

یقیناً میں نے کہا ہے "موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے"۔ لیکن اگر میں یہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ میں نہیں جانتا کہ مجھ سے کیوں یہ توقع کی جائے کہ ایک چیز کو اس کے اصلی نام سے نہ پکاروں؟ میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں۔

میں کم سے کم اور نرم سے نرم لفظ جو اس بارے میں بول سکتا ہوں، یہی ہے۔

میں یقیناً یہ کہتا رہا ہوں کہ ہمارے فرض کے سامنے دو ہی راہیں ہیں گورنمنٹ ناانصافی اور حق تلفی سے باز آجائے۔ اگر باز نہیں آسکتی تو مٹا دی جائے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ یہ تو انسانی عقاید کی اتنی پرانی سچائی ہے کہ صرف پہاڑ اور سمندر ہی اس کے ہم عمر کہے جا سکتے ہیں۔ جو چیز بری ہے اسے یا تو درست ہونا چاہیے یا مٹ جانا چاہیے تیسری بات کیا ہو سکتی ہے؟ جب کہ میں اس گورنمنٹ کی برائیوں پر یقین رکھتا ہوں تو یقیناً یہ دعا نہیں مانگ سکتا کہ وہ درست بھی نہ ہو اور اس کی عمر بھی دراز ہو۔

میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور ہر قوم کا پیدائشی حق ہے۔ کوئی انسان یا انسانوں کی گھڑی ہوئی بیوروکریسی یہ حق نہیں رکھتی کہ خدا کے بندوں کو محکوم بنائے، محکومی اور غلامی کے لیے کیسے ہی خوشنما نام کیوں نہ رکھ لیے جائیں وہ غلامی ہی ہے اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے۔ پس میں موجودہ گورنمنٹ کو جائز تسلیم نہیں کرتا اور اپنا ملکی، مذہبی اور انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس کی محکومی سے ملک اور قوم کو نجات دلاؤں۔

انصاف کی پامالی میں اس کی جرأت ان تھک اور دلیری بالکل لگام ہیں۔ سمرنا میں ۸۰ فیصدی مسلمانوں کی آبادی ہے مگر وزیر اعظم بغیر کسی شرمندگی کے مسیحی آبادی کی کثرت کا اعلان کر دیتا ہے۔ یونانی حکومت تمام اسلامی آبادی کو خون اور آگ کے سیلاب میں غرق کر دیتی ہے لیکن وہ بے دھڑک ترکی مظالم کی فرضی داستانیں بیان کرتا رہتا ہے اور

خود انگلستان کے بھیجے ہوئے امریکن کمیشن کی رپورٹ پوشیدہ کردی جاتی ہے۔

پھر نہ توان تمام مظالم وجرائم کے لیے اس کے پاس اعتراف ہے نہ تلافی بلکہ ملک کی جائز اور بااصن جدوجہد کو پامال کرنے کے لیے ہرطرح کا جبروتشدد شروع کردیا جاتا ہے اور وہ سب کچھ کیا جاتا ہے جو گزشتہ ایک سال کے اندر ہوچکا ہے۔۔۔۔ اس وقت تک ملک کے ہر حصّے میں ہورہا ہے میں اگر ایسی گورنمنٹ کو "ظالم" اور "یادرست ہوجاؤ یامٹ جاؤ" نہ کہوں تو کیا "عادل" اور "درست ہونہ مٹو" کہوں؟

کیا صرف اس لیے کہ ظلم طاقتور ہے اور اس کے پاس جیل ہے اس کا حقدار ہوجاتا ہے کہ اس کا نام بدل دیا جائے؟ میں اٹلی کے نیک اور حریت پرست جوزف میزینی کی زبان میں کہوں گا "ہم صرف اس لیے کہ تمھارے ساتھ عارضی طاقت ہے تمھاری برائیوں سے انکار نہیں کرسکتے۔"

میں اپنا بیان اٹلی کے قتیل صداقت گارڈینیو برونو کے لفظوں پر ختم کرتا ہوں جو میری ہی طرح عدالت کے سامنے کھڑا کیا گیا تھا:۔

"زیادہ سے زیادہ جو سزا دی جاسکتی ہے بلاتامل دے دو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ سزا کا حکم لکھتے ہوئے جس قدر جنبش تمھارے دل میں پیدا ہوگی، اس کا عشرِ عشیر اضطراب بھی سزا سن کر میرے دل کو نہ ہوگا۔"

مسٹر مجسٹریٹ اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصّے میں یہ مجرموں کا کٹہرا آیا ہے تمھارے حصّے میں مجسٹریٹ کی کرسی۔ وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہے جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کردیں۔ مورخ ہمارے انتظار میں ہے۔ اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں یہاں جلد جلد آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے۔ وقت اس کا جج ہے وہ فیصلہ لکھے گا اور اس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔

فرحت اللہ بیگ

ایک وصیت کی تعمیل

خدا بخشے مولوی وحیدالدین سلیم بھی ایک عجیب چیز تھے، ایک نگینہ سمجھیے کہ برسوں ناتراشیدہ رہا۔ جب تراشا گیا، پھل نکلے، چمک بڑھی، اہل نظر میں قدر ہوئی، اس وقت چٹ سے ٹوٹ گیا۔ شہرت بھی غالب کے قصیدے کی طرح آج کل کسی کو راس نہیں آتی۔ ادھر نام بڑھا اور اُدھر مرا۔ صف سے آگے نکلا اور تیر قضا کا نشانہ ہوا۔ چل چلاؤ کا زور ہے آج یہ گیا، کل وہ گیا۔ مولوی نذیر احمد گئے، شبلی گئے، حالی گئے، وحیدالدین گئے۔ اب بڑوں میں مولوی عبدالحق رہ گئے ہیں ان کو بھی شہرت کی ریہہ لگ گئی ہے، سوکھتے چلے جارہے ہیں کسی دن یہ بھی خشک ہوکر رہ جائیں گے۔ یہ تو جو کچھ تھا سو تھا۔ ایک نئی بات یہ ہے کہ آج کل کا مرنا بھی کچھ عجیب مرنا ہوگیا ہے۔ پہلے زندگی کو چراغ سے تشبیہ دیتے تھے۔ بتی جلتی، تیل خرچ ہوتا، تیل ختم ہونے کے بعد چراغ جھلملاتا، ٹمٹماتا، لَو بیٹھنی شروع ہوتی، اور آخر رفتہ رفتہ ٹھنڈا ہوجاتا۔ اب چراغ کی جگہ زندگی بجلی کا لیمپ ہوگئی ہے۔ اِدھر بٹن دبایا، اُدھر اندھیر اگھپ۔ عظمت اللہ خاں اسی طرح مرے۔ مولوی وحیدالدین اسی طرح رخصت ہوئے۔ اب دیکھیں کس کی باری ہے۔ اُردو کی مجلس میں دو چار لیمپ جل رہے ہیں وہ بھی کسی وقت کھٹ سے گل ہوجائیں گے۔ اس کے بعد بس اللہ ہی اللہ ہے۔

میں مدت سے حیدرآباد میں ہوں۔ مولوی وحیدالدین بھی برسوں سے یہاں تھے لیکن کبھی ملنا نہیں ہوا۔ انھیں ملنے سے فرصت نہ تھی۔ آخر ملے تو کب ملے کہ مولوی صاحب مرنے کو تیار بیٹھے تھے۔ گزشتہ سال کالج کے جلسے میں مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے اورنگ آباد کھینچ بلایا۔ روانہ ہونے کے لیے جو حیدرآباد کے اسٹیشن پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اسٹیشن کا اسٹیشن اورنگ آباد جانے والوں سے بھرا پڑا ہے۔ طالب علم بھی ہیں، ماسٹر بھی ہیں، کچھ ضرورت سے جارہے ہیں، کچھ بے ضرورت چلے جارہے ہیں، کچھ واقعی مہمان ہیں۔ کچھ بن

بلائے مہمان ہیں۔ غرض یہ کہ آدھی ریل اپنی اورنگ آباد کے مسافروں نے گھیر رکھی ہے۔ ریل کی روانگی میں دیر تھی۔ سب کے سب پلیٹ فارم پر کھڑے گپیں مار رہے تھے۔ میں بھی ایک صاحب سے کھڑا باتیں کر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں ایک بڑے میاں بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے بڑے بڑے ڈگ بھرتے میری طرف چلے آرہے ہیں۔ متوسط قد، بھاری گٹھیلا بدن، بڑی سی توند، کالی سیاہ فام رنگت اس پر چھوٹی سی گول داڑھی، چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں، شرعی سفید پائجامہ، کتھئی رنگ کے کشمیرے کی شیروانی، سر پر عنابی ترکی ٹوپی، پاؤں میں جرابیں اور انگریزی جوتا، آئے اور آتے ہی مجھے گلے لگا لیا۔ حیران تھا کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ کیا امیر حبیب اللہ خاں اور مولوی نذیر احمد مرحوم کی ملاقات کا دوسرا سین ہونے والا ہے، جب ان کی اور میری ہڈیاں پسلیاں گلے ملتے ملتے تھک کر چُور ہو گئیں، اس وقت انھوں نے فرمایا۔

"میاں فرحت! مجھے تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا جب سے تمھارا نذیر احمد والا مضمون دیکھا ہے، کئی دفعہ ارادہ کیا کہ گھر پر آکر ملوں، مگر موقع نہ ملا۔ قسمت میں ملنا تو آج لکھا تھا۔ بھئی! مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جیسا شاگرد اس کو ملا۔ مرنے کے بعد بھی ان کا نام زندہ کر دیا۔ افسوس ہے کہ ہم کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملتا جو مرنے کے بعد اسی رنگ میں ہمارا حال بھی لکھتا"۔

میں پریشان تھا کہ یا اللہ یہ کون ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں۔ مگر میری زبان کب رکتی ہے میں نے کہا "مولوی صاحب! آپ گھبراتے کیوں ہیں۔ بسم اللہ کیجیے، مر جائیے مضمون میں لکھ دوں گا"۔ کیا خبر تھی کہ سال بھر کے اندر ہی اندر مولوی صاحب مر جائیں گے اور مجھے ان کی وصیت کو پورا کرنا پڑے گا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ مولوی وحید الدین سلیم ہیں تو واقعی مجھے بہت پشیمانی ہوئی۔ میں نے معذرت کی وہ خود شگفتہ طبیعت لے کر آئے تھے رنج تو کجا بڑی دیر تک ہنستے اور اس جملے کے مزے لیتے رہے۔ سر ہو گئے کہ جس گاڑی میں تو ہے میں بھی اسی میں بیٹھوں گا۔ شاگردوں کی طرف دیکھا۔ انھوں نے سامان لا میرے درجے میں رکھ دیا۔ ادھر گاڑی چلی اور ادھر اُن کی زبان چلی۔ رات کے بارہ بجے، ایک بجے، دو بج گئے۔ مولوی صاحب نہ خود سوتے ہیں نہ سونے دیتے ہیں۔ درجہ اول میں ہم تین آدمی تھے۔ مولوی صاحب، میں اور رفیق بیگ، رفیق بیگ تو سو گئے۔ ہم دونوں نے باتوں میں صبح کر دی۔ اپنی زندگی کے حالات بیان کیے، اپنے علمی کارناموں کا ذکر چھیڑا۔ اصطلاحات زبان اردو پر بحث ہوتی رہی۔ شعر و شاعری

ہوئی، دوسروں کی خوب خوب برائیاں ہوئیں، اپنی تعریفیں ہوئیں۔ مولوی عبدالحق کو بُرا بھلا کہا کہ اس بیماری میں مجھے زبردستی کھینچ بلایا۔ غرض چند گھنٹے بڑے مزے سے گزر گئے۔ صبح ہوتے ہوتے کہیں جاکر آنکھ لگی۔ شاید ہی گھنٹہ بھر سوئے ہوں گے کہ ان کے شاگردوں اور ساتھیوں نے گاڑی پر یورش کر دی۔ پھر اٹھ بیٹھے۔ اور پھر وہی علمی مباحث شروع ہوئے پھبتیاں اڑیں، اس کو بے وقوف بنایا، اس کی تعریف کی، ہنسی اور قہقہوں کا وہ زور تھا کہ درجے کی چھت اُڑی جاتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے نواب مسعود جنگ اپنے پاس لے گئے اور یہاں اورنگ آباد تک وہی غل غپاڑہ رہا۔

میں شاعر نہیں ہوں، ہاں بعض دوستوں کی فرمائش سے زبردستی شعر کہتا ہوں مجھے بڑا تعجب ہوا جب مولوی صاحب نے کہا " فرحت تو شاعر ہے، کیوں اس جوہر کو خاک میں ملا رہا ہے، ہو سکے تو کچھ کہہ لیا کر" میرے ایک قطعۂ تاریخ سے ایسے خوش ہوئے کہ اسی وقت اُٹھ قلم دوات نکال وہ قطعہ لکھ لیا۔ آپ بھی سُن لیجئے۔ کہتے ہیں نئی طرز کی تاریخ ہے ہو گی۔ ہم کو تو نہ اس کے لکھنے میں دماغ سوزی کرنی پڑی اور نہ اس کی کوئی قدر ہے۔ ہاں قطعے سے پہلے اس کی شان نزول سن لیجیے۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے ایک نہایت عزیز دوست کے دماغ میں یورپ جانے کے خیالات ہمیشہ چکر لگاتے تھے۔ پیسہ پاس نہیں تھا مگر چاہتے تھے کہ ساری دنیا میں پھریں اور وہ بھی اس طرح نہیں کہ جس طرح امریکہ والے پھرتے ہیں بلکہ اس طرح جیسے پہلے زمانے کے سیاح پھرتے تھے۔ اِدھر کوشش کی اُدھر کوشش کی۔ آخر کار سرکار سے منظوری ہو ہی گئی۔ ڈھائی تین برس میں سارا یورپ چھان مارا۔ شمالی افریقہ کے سب ملک دیکھ لیے۔ عراق، عرب، شام، ترکی۔ غرض سیکڑوں ملکوں کی سیر کی۔ آئے اور بڑی دھوم دھام سے آئے اور وہ نام پیدا کیا کہ خدا سب کو نصیب کرے۔ دوستوں نے مجھ سے تاریخ کہنے کا تقاضا کیا۔ مار مار کر شاعر بنایا، تاریخ ہوئی ہے:

پھر پھرا کر مرے اک دوست سفر سے آئے
بار تاریخ کا ڈالا گیا میرے سر پر
دوستوں کا ہے تقاضا کہ لکھو جلد لکھو
میں بھی شاعر ہوا اللہ کی قدرت ہے مگر

میرے انکار سے احباب نہ رنجیدہ ہوں
اس لیے لکھتا ہوں تاریخ بہت ڈر ڈر کر
ایک طائر کو قفس میں تھا خیالِ گلشن
پر سمیٹے ہوئے بیٹھا تھا جھکائے ہوئے سر
رحم کچھ آ گیا صیّاد کے دل میں شاید
ہٹ گیا سامنے سے ایک طرف کھول کے در
در کھلا پایا تو آہستہ سے طائر نکلا
پھر چلا تیر سا گلشن کی طرف مار کے پر
خوب دل بھر کے مزے زمزمہ سنجی کے لیے
خوب دل کھول کے باغوں میں لگائے چکّر
بچتا وہ گردشِ افلاک سے آخر کب تک
ہوتا کب تک نہ زمانے کے تغیّر کا اثر
آب و دانہ اسے پھر کھینچ کے لایا سوئے دام
باندھے صیّاد نے پھر طائر آزاد کے پر
لکھی فرحت نے ہے کس زور سے فصلی تاریخ
پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر

میں نے باتوں باتوں میں یہ بھی کوشش کی کہ مولوی صاحب کی طبیعت کا اندازہ لگاؤں، پہلے تو ذرا بند بند رہے لیکن آخر میں بالکل کھل گئے۔ میں نے جو رائے ان کے متعلق قائم کی ہے، وہ سُن لیجیے۔ سب سے پہلے یہ ہے کہ ان میں ظرافت کا مادہ بہت تھا، لیکن یہ ظرافت اکثر رکاکت کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ کسی کو بُرا بھی کہتے تو ایسے الفاظ میں کہتے کہ سننے سے تکلیف ہوتی اور کہنے پر آتے تو پھر یہ نہ دیکھتے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کس کے سامنے کہہ رہا ہوں۔ نتیجہ اکثر یہ ہوتا کہ لوگ ادھر سے اُدھر لگا دیتے اور مولوی صاحب کی کسی نہ کسی سے بگڑ جاتی۔ شاید ہی کوئی بھلا آدمی ہوگا جو سچے دل سے ان کو چاہتا ہو۔ ان کے علم، ان کی سمجھ، ان کی زود فہمی اور ان کی طبع رسا کی سب تعریف کرتے ہیں لیکن ان کی طبیعت کے سب شاکی ہیں اور وہ خود بھی اس سے بیزار، مجھ سے بیزار، تم سے بیزار، غرض اپنے سوا ساری دُنیا

سے بیزار تھے، بات یہ ہے کہ انھوں نے زمانے کی وہ ٹھوکریں اٹھائی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ خاصہ بھلا چنگا آدمی دیوانہ ہو جائے، اگر مولوی صاحب کی طبیعت پر ان مصیبتوں نے اتنا اثر کیا تو کیا تعجب ہے۔ جب کسی نااہل کو بڑی خدمت پر دیکھتے تو ان کے آگ لگ جاتی۔ ریل میں ایک دو بڑے شخصوں کا ذکر آیا۔ انھوں نے ہر دفعہ یہی کہا۔ "ارے میاں گدھا ہے ایک سطر صحیح نہیں لکھتا۔ اور دیکھو تو کون ہیں کہ نواب صاحب ہم کو دیکھو تمام عمر علم حاصل کرنے میں گزار دی۔ اس اخبار کی ایڈیٹری کی، اُس رسالے کے مینجر ہوئے۔ سرسید کی خدمت میں سرگاڑی پاؤں پہیا کیا۔ اب جو چند روپئے مل رہے ہیں تو فلاں صاحب جلے جاتے ہیں، خبر نہیں کچھ ہوتے تو گلا ہی گھونٹ دیتے۔" میں نے کہا۔ "مولوی صاحب! یہ دنیا ہے۔ آخرت نہیں ہے کہ جیسا بوؤگے ویسا پھل ملے گا۔ یہاں اہل کمال ہمیشہ سے آشفتہ حال رہے ہیں۔ آپ کیوں خواہ مخواہ اپنا دل جلاتے ہیں۔ جو اللہ نے دیا ہے بہت ہے۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔ مزے کیجیے۔ بہت گئی ہے تھوڑی رہی ہے ہنسی خوشی یہ بھی گزار دیجیے۔" وہ بھلا میری باتوں کو کیا سننے والے تھے۔ ان کے تو دل میں زخم تھے۔ تمام عمر مصیبت اٹھائی تھی، نااہلوں کو آرام و آسایش میں دیکھ کر وہ زخم ہرے ہو جاتے تھے۔ زبان اپنی تھی، کسی کا دینا نہیں آتا تھا، بے نقط سُنا کر دل ٹھنڈا کر لیتے تھے۔

زمانے کے ہاتھوں ان کی طبیعت میں ایک دوسرا انقلاب یہ بھی ہو گیا تھا کہ جتنی ان کی نگاہ وسیع ہوئی، اتنا ان کا دل تنگ ہوا۔ جتنی ان کے قلم میں روانی پیدا ہوئی۔ اتنی ان کی مٹھی بند ہوئی۔ میں ان کے پیٹھ پیچھے نہیں کہتا۔ جب ان کے منھ پر کہہ چکا ہوں کہ مولوی صاحب آپ کی کفایت شعاری نے بڑھتے بڑھتے کنجوسی کی شکل اختیار کر لی ہے تو اب لکھتے کیوں ڈروں۔ واقعی بڑے ہی کنجوس تھے۔ ہزار روپے کے گرہ‌ڈیم تھے۔ دارالترجمہ سے بہت کچھ مل جاتا تھا مگر خرچ کی پوچھو تو صفر سے کچھ ہی زیادہ ہوگا۔ اس کی صراحت میں آگے چل کر کروں گا۔ ہاں ان کا یہ عذر سب کو ماننا پڑے گا کہ مفلسی کے پے در پے حملوں نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اس خدمت پر کب تک ہیں اور کب نکال دیے جائیں گے۔ خشک سالی کے اندیشے سے ارزانی کے زمانے میں کھتے بھرنے کی فکر میں رہے۔ خود چل بسے اور جمع کی پونجی دوسروں کے لئے چھوڑ گئے اور چھوڑ بھی اتنی گئے کہ بعض لوگوں کو افسوس ہوا کہ ہم ان کے بیٹے کیوں نہ ہوئے۔

بہر حال یونہی ہنستے بولتے دو بجے اورنگ آباد پہنچ گئے۔ بڑے زور کا استقبال ہوا۔ موٹروں میں لد کر اورنگ آباد کالج پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ یہاں سے وہاں تک خیمے ہی خیمے لگے ہیں، خیموں کے سامنے جلسے کا منڈوا ہے۔ منڈوے کے سامنے جو خیمہ تھا' اس میں مجھے اور مولوی صاحب کو جگہ ملی۔ مولوی صاحب کی طبیعت پہلے سے بدمزہ تھی۔ راستے کی تکان اور رات بھر کے جاگنے سے اور خراب ہوگئی۔ بخار چڑھ آیا۔ دو وقت کھانا نہیں کھایا۔ تیسرے وقت بڑے کہنے سننے سے تھوڑا سا دودھ پیا۔ دوسرے روز ان کا لکچر تھا۔ طبیعت صاف نہیں تھی۔ پھر بھی بڑے میاں کو جوش آگیا۔ ٹرنک میں سے جوڑا نکالا۔ ریشمی شیروانی نکالی، نئی ترکی ٹوپی نکالی، اپنا میلا کچیلا جوڑا پھینک نیا پہن اس ٹھاٹھ سے جلسے میں آئے کہ واہ واہ! کھڑے ہو کر لکچر دینے کا دم نہ تھا۔ اسٹیج پر کرسی بچھا دی گئی۔ انھوں نے جیب میں سے چھوٹے چھوٹے نیلے کاغذ کے پرچوں کی ایک گڈی نکالی اور لکچر پڑھنا شروع کیا۔ میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا تھا کہ اسپیچ کے پڑھنے میں الفاظ کا زور کم ہو جاتا ہے۔ مگر مولوی صاحب کے طرز ادا نے میرا خیال بالکل بدل دیا۔ ان کے پڑھنے میں بھی وہی بلکہ اس سے زیادہ زور تھا جتنا بولنے میں آتا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ شیر گرج رہا ہے۔ تقریباً دو ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ مگر سناٹے کا یہ عالم تھا کہ سوئی گرے تو آواز سن لو۔ لفظوں کی نشست، زبان کی روانی، آواز کے اُتار چڑھاؤ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے کہ اُمڈا چلا آرہا ہے یا ایک برقی رَو ہے کہ کانوں سے گزر کر دل و دماغ پر اثر کر رہی ہے' برس روز ہو چکا ہے مگر اب تک وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں نے بڑے بڑے لکچر دینے والوں کو سنا ہے مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ لکچر پڑھ کر ایسا اثر پیدا کرنے والا میری نظر سے کوئی نہیں گزرا۔ کچھ تو بات تھی کہ آخر آخر زمانے میں سرسید مرحوم اپنے لکچر انھیں سے پڑھوایا کرتے تھے، یا پڑھتے پڑھتے یہ خود منجھ گئے تھے یا ان کی خداداد قابلیت تھی، جس کو دیکھ کر سرسید مرحوم نے اس کام کے لیے ان کا انتخاب کیا تھا۔ غرض کچھ ہی ہو' اس میدان میں ان کا مدمقابل نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

اسی روز ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ اس کا خیال کر کے اب تک مجھے ہنسی آتی ہے۔

"۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ" اس جلسے میں زندہ کیا گیا تھا، وہی ساز و سامان، وہی کپڑے اور وہی لوگ' سو برس کے بعد پھر سامنے لائے گئے تھے۔ اسٹیج کے انتظام ہی کے لیے مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے پکڑ بلایا تھا۔ پہلے بہروپ اور نقلیں ہوتی رہیں۔ آخر پردہ گرا۔ اور

مشاعرے کا نمبر آیا۔ تھوڑی دیر میں اسٹیج کا رنگ بدلنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ دریاں، چاندنیاں قالین، گاؤ تکیے لگانا، سامان جمانا، مشعلیں جلانا۔ غرض اتنا کام تھا کہ پردہ گرے گرے بڑی دیر ہوگئی، اور لوگوں میں ذرا ہلچل ہونے لگی۔ مجھے اس وقت سوا اس کے اور کچھ نہ سوجھا کہ ایک چھوٹی سی تقریر کر کے اس بے چینی کو کم کروں۔ میں نے کہا۔ "یارو! ذرا جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ میں باہر جا کر کچھ بولنا شروع کرتا ہوں تمھارا کام جب ختم ہو جائے تو سیٹی بجا دینا میں اپنی اسپیچ ختم کردوں گا۔" اتنا کہہ کر میں چٹ باہر پردے کے سامنے آ گیا۔ مضمون سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس وقت یہی سمجھ میں آیا کہ اپنے مضمون کی تمہید کو ذرا مذاق میں ادا کردوں۔ جن صاحبوں نے وہ مضمون پڑھا ہے وہ واقف ہیں۔ میں نے اس مضمون کو مولوی کریم الدین صاحب مؤلف "طبقات شعرائے ہند" سے منسوب کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ مشاعرہ انھی کے مکان پر نواب زین العابدین خاں کی مدد سے ہوا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے لکچر میں ابتداءً اس زمانے کی دہلی کا نقشہ کھینچا اور پھر مولوی کریم الدین صاحب کا پانی پت سے دہلی آنا مذاقیہ پیرائے میں بیان کیا۔ ان کی پھٹی ہوئی جوتیوں، ان کے خاک آلود کپڑوں، ان کی وحشت زدہ شکل اور ان کی مفلسی کا نقشہ خدا جانے کن کن الفاظ میں کھینچ گیا۔ پھر ان کے دہلی میں آکر تعلیم پانے، مسجد کی روٹیوں پر پڑے رہنے، دوسروں کی مدد سے مطبع کھولنے کا ذکر کر کے یہ بتایا کہ آخر کس طرح اس مشاعرے کی اجازت ہوئی اور کس طرح دہلی کے تمام شعرا، اس میں جمع ہوئے۔ میں اسپیچ دینے میں سیدھا کھڑا نہیں رہتا۔ کچھ ہاتھ پاؤں بھی ہلاتا ہوں۔ خدا معلوم مولوی کریم الدین کا حال بیان کرنے میں کیوں میرے ہاتھ کا اشارہ کئی دفعہ مولوی وحید الدین سلیم کی طرف ہو گیا۔ مجھے تو معلوم نہیں مگر جلسے میں اس نے کچھ اور ہی معنی پیدا کر لیے۔ مولوی صاحب کے والد بھی پانی پت سے دہلی آئے تھے۔ کتابوں کا بیوپار کرتے تھے۔ لوگ سمجھے کہ مولوی کریم الدین ہی مولوی وحید الدین کے والد تھے۔ ناموں کے یکساں ہونے نے اس خیال کو اور تقویت دی۔ اب جو ہے وہ مولوی صاحب سے پوچھتا ہے۔ "مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے؟" مولوی صاحب کے تاؤ کی کچھ نہ پوچھو، دل ہی دل میں اونٹتے رہے۔ خدا خدا کر کے ڈیڑھ بجے مشاعرہ ختم ہوا۔ اسٹیج کے دروازے سے جو نکلتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی صاحب دیوار سے چپکے کھڑے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بپھر گئے۔ کہنے لگے۔ "فرحت! یہ سب تیری شرارت ہے کریم الدین کو میرا باپ بنا دیا۔" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ بڑی

مشکل سے مولوی صاحب کو ٹھنڈا کیا۔ وہاں سے لے جاکر خیمے میں بٹھایا۔ پان بناکر دیا، سگریٹ پیش کیا۔ جب جاکر ذرا نرم پڑے اور واقعہ بیان کیا۔ میں نے کہا: "مولوی صاحب! بھلا مجھ سے ایسی گستاخی ہو سکتی تھی۔ اول تو اس مذاق کا یہ موقع ہی کیا تھا۔ دوسرے مجھے کیا معلوم کہ آپ کے والد کون تھے، کہاں کے تھے، دہلی آئے بھی تھے یا نہیں۔ کتابیں بیچتے تھے یا کیا کرتے تھے؟"

کہنے لگے "گھڑی گھڑی ہاتھ سے میری طرف کیوں اشارہ کرتا تھا؟" میں نے کہا۔ "مولوی صاحب! اسپیچ دینے میں ہاتھ کا اشارہ خود بخود اسی طرح ہو جاتا ہے۔ اب اگر اگلی صف میں بیٹھ کر آپ اس اشارے کو اپنے سے متعلق کر لیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔"

بہر حال یہ بات لوگوں کے دلوں میں کچھ ایسی جم گئی کہ مٹائے نہ مٹی۔ جب تک اورنگ آباد میں رہے ہر شخص مولوی صاحب سے یہی سوال کرتا تھا "مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین آپ کے والد تھے؟" یہ کبھی تو ہنس کر چپ ہو جاتے، کبھی صرف جھڑک دیتے، کبھی جل کر کہتے۔ "جی ہاں، میرے والد تھے کچھ آپ کا دینا آتا ہے۔"

اورنگ آباد سے واپس آنے کے بعد میرا ان کے ہاں آنا جانا بہت ہو گیا تھا۔ جو کچھ لکھتا پہلے ان کو جاکر سناتا، بڑے خوش ہوتے، تعریفیں کرتے، دل بڑھاتے، ہائے ان کے گھر کا نقشہ اس وقت آنکھوں میں پھر گیا۔ گھر بہت بڑا تھا مگر خالی ڈھنڈار، ساٹھ روپے مہینہ کرایہ دیتے اور اپنی اکیلی جان سے رہتے، نہ بال نہ بچہ، نہ نوکر نہ ماما، میں گیا، باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ آواز آئی "کون؟" میں نے کہا۔ "فرحت" اسی وقت کرتا پہنتے ہوئے آئے، دروازہ کھولا، اندر لے گئے، برآمدے میں ایک بان کی چارپائی پڑی ہے، دو تین تخت، جھڑی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں ہیں۔ اندر ایک ذراسی دری بچھی ہے، اس پر میلی سی چاندنی ہے، دو چار چوہا چکٹ تکیے اور ایک سڑی ہوئی رضائی رکھی ہے۔ دیواروں پر ایک دو سگریٹ کے اشتہاروں کی تصویریں اور تین چار پرانے کیلنڈر لٹکے ہیں، سامنے دیوار کی الماری میں پانچ چھ کنڈا ٹوٹی چائے کی پیالیاں، کنارے جھڑی رکابیاں، ایک دو چائے کے ڈبے رکھے ہیں، سامنے کے کمرے میں کھونٹیوں پر دو تین شیروانیاں، دو تین ٹوپیاں لٹک رہی ہیں، نیچے دو تین پرانے کھڑنک جوتوں کے جوڑے پڑے ہیں۔ لیجیے، مولوی صاحب کے گھر بار کا یہ خلاصہ ہے۔

مولوی صاحب بیٹھے ہیں، سامنے دو انگیٹھیاں رکھی ہیں، ایک پر پانی، دوسری پر دودھ

جوش ہو رہا ہے۔ چائے بن رہی ہے، خود پی رہے ہیں، دوسروں کو پلا رہے ہیں، ایک نمک کا ڈلا پاس رکھا ہے، چائے بنائی، نمک کے ڈلے کو ڈال کر دو ایک چکر دے کر نکال لیا بس سارے دن ان کا یہی شغل تھا۔ گھر میں برتن ہی نہیں تھے، کھانا کیسے پکتا اور کون پکاتا۔ خبر نہیں کہاں جا کر کھا پی آتے تھے۔ کبھی میں گیا دیکھا کہ دروازے میں یہ بڑا قفل لٹک رہا ہے، سمجھ گیا کہ مولوی صاحب کہیں چرنے چگنے تشریف لے گئے۔ میں نے کئی دفعہ پوچھا بھی کہ مولوی صاحب! آپ کے ہاں کچھ پکتا پکاتا نہیں، کہنے لگے۔ "نہیں بھئی میں نے مدتوں سے کھانا چھوڑ دیا ہے صرف چائے پر گزران ہے۔" تم مان لو، میں تو نہیں مانتا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان کو کھاتے اور خوب کھاتے دیکھا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنے گھر کا پکا نہیں کھاتے تھے، اور کھاتے تو کیونکر کھاتے، پکانے کا انتظام کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ماما رکھنی پڑتی، سامان منگوانا ہوتا، لکڑی کا خرچ، تیل کا خرچ، نون کا خرچ، غرض اتنے خرچ کون اپنے سر باندھے اور اپنی بھلی چنگی جان کو بیٹھے بٹھائے روگ لگائے، چائے بنائی پی لی، اِدھر اُدھر گئے، پیٹ بھر لیا۔ گھر آئے بان کی کھرّی چارپائی پر لوٹ ماری۔ چلو زندگی کا ایک دن کٹ گیا۔ ان کی بان کی چارپائی بھی نمائش میں رکھنے کے قابل تھی۔ ننگی پیٹھ اس پر اتنا لوٹے تھے کہ بان صاف اور چمکدار ہو کر کالی اطلس ہو گیا تھا۔ ادوان خود کھینچتے تھے اور ایسی کھینچتے تھے کہ ہاتھ مارو تو طبلے کی آواز دے۔ خدا معلوم اب یہ چارپائی کس کے قبضے میں ہے، کسی کے بھی پاس ہو، سونے میں بڑا آرام دے گی۔

مولوی صاحب کو مٹھاس کا بڑا شوق تھا۔ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے، ان کے بھی یار دوست شاگرد غرض کوئی نہ کوئی ان کو مٹھائی پہنچا ہی دیتا تھا۔ یہ کچھ کھاتے کچھ رکھ چھوڑتے مٹھائی کی ٹوکریوں میں جو کاغذ آتے ان کو پونچھ پانچھ صاف کر جمع کرتے جاتے۔ انہی کاغذوں پر خط لکھتے، غزلیں لکھتے۔ غرض جو کچھ لکھنا پڑھنا ہوتا بس انہی کاغذوں پر ہوتا، خدا معلوم ایسے جھبرے کاغذ پر یہ لکھتے کیوں کر تھے۔

مولوی صاحب دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے، ہاں ڈرتے تھے تو مولوی عبدالحق صاحب سے، میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق ان کی رائے معلوم کروں مگر وہ کسی نہ کسی طرح ٹال گئے۔ تھوڑے دن اور جیتے تو پوچھ ہی لیتا۔ دوسروں کے متعلق مجھے ان کی رائے معلوم ہے اگر ان ہی کے الفاظ میں لکھوں تو ابھی فوجداری ہو جائے۔

مولوی صاحب کو اصطلاحات وضع کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ ایسے ایسے الفاظ دماغ سے اتارتے کہ باید وشاید۔ جہاں ثبوت طلب کیا اور انھوں نے شعر پڑھا اور کسی نہ کسی بڑے شاعر سے منسوب کر دیا۔ اب خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ خود ان کا شعر ہوتا تھا یا واقعی اس شاعر کا۔ بھلا ایک ایک لفظ کے لیے کون دیوان ڈھونڈتا بیٹھے۔ اگر کوئی تلاش بھی کرتا اور وہ شعر دیوان میں نہ ملتا تو یہ کہدینا کیا مشکل تھا کہ یہ غیر مطبوعہ کلام ہے۔ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے، مگر انگریزی اصطلاحات پر پورے حاوی تھے۔ یہی نہیں بلکہ یہاں تک جانتے تھے کہ اس لفظ کے کیا ٹکڑے ہیں، ان ٹکڑوں کی اصل کیا ہے اور اس اصل کے کیا معنی ہیں۔ اس بلا کا حافظہ لیکر آئے تھے کہ ایک دفعہ کوئی لفظ سنا اور یاد ہو گیا۔ الفاظ کے ساتھ انھوں نے اس پر بھی بہت غور کیا تھا کہ انگریزی اصطلاحات بنانے میں کن اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ انھیں اصولوں کو وہ اردو کی اصطلاحات وضع کرنے میں کام میں لاتے اور ہمیشہ کامیاب ہوتے۔ میری کیا اس وقت سب کی یہی رائے ہے کہ اصطلاحات بنانے کے کام میں مولوی وحیدالدین سلیم اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اور اب ان کے بعد ان کا بدل ملنا دشوار تو کیا ناممکن ہے۔ عربی اور فارسی میں اچھی دسترس تھی مگر وہ اردو کے لیے بنے تھے اور اردو ان کے لیے۔

خوب سمجھتے تھے اور خوب سمجھاتے تھے، زبان کے جو نکات وہ اپنے شاگردوں کو بتا گئے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ کالج کے لونڈے وہ مضمون لکھ جاتے ہیں، جو بڑے بڑے اہلِ قلم کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتے۔ مولوی صاحب کیا مرے، زبان اردو کا ایک ستون گر گیا اور ایسا ستون گرا کہ اس جیسا بننا تو کجا اس جگہ میں اڑواڑ بھی لگانی مشکل ہے۔

احتشام حسین

ادب اور تہذیب

کبھی کبھی یہ سوال پوچھا بھی جاتا رہا ہے اور خود میرے ذہن کو الجھاتا رہا ہے کہ کسی قوم کی تہذیبی زندگی سے اس کے ادب کا کیا تعلق ہوتا ہے۔ بادی النظر میں یہ سوال ایک جانی بوجھی چیز سے متعلق ہے اور ہر شخص کسی نہ کسی شکل میں یہ جانتا ہے کہ تہذیب ایک ملک کے فنونِ لطیفہ، ادب، فلسفیانہ خیالات، طرزِ معاشرت، مادّی ترقی اور زندگی کے متضاد اور متصادم عناصر کو متوازن بنا کر اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی کا ایک خوشگوار احساس پیدا کرنے سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ طبقاتی سماج میں مختلف طبقوں کے لیے اس کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے لیکن کسی نہ کسی قسم کی تہذیبی زندگی کا وجود، طریقِ پیداوار پر قدرت رکھنے کی مناسبت سے لازمی ہے۔ تہذیب کیا ہے؟ اس کے متعلق میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ جب ہم یہ لفظ (تہذیب) استعمال کرتے ہیں تو اس سے کسی قوم یا ملک کی داخلی یا خارجی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں سے مجموعی طور پر پیدا ہونے والی وہ امتیازی خصوصیات مراد ہوتی ہیں جنھیں اس ملک کے لوگ عزیز رکھتے ہیں اور جن کے حوالے سے وہ دنیا میں پہچانا جاتا ہے، انسان قدروں کے بنانے اور محفوظ رکھنے کی جد و جہد میں اپنی قومی تہذیب پیدا کرتا ہے وہ تہذیب اس کے ماضی سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور دُنیا کی عام رفتارِ ترقی سے نسبت رکھتی ہے۔ تہذیب قومی زندگی کی ساری جذباتی، رُوحانی اور مادی امنگوں اور خواہشوں کا احاطہ کر لیتی ہے، اس کو بناتی اور سنوارتی ہے، اسے ایک ایسا نصب العین بخشتی ہے جو زمانے کی ضروریات کا ساتھ دے سکے۔ وہ ان ساری طاقتوں کو سمیٹے ہوئے آگے بڑھتی ہے جو ماضی نے اسے عطا کی ہیں۔ میرے خیال میں تہذیب سے عام طور پر یہی باتیں مقصود ہوتی ہیں، اس طرح تہذیب ایک قوم کے شعور کی منظہر بن جاتی ہے۔ لیکن اس کی سطح کبھی یکساں نہیں ہوتی کیونکہ تہذیبی اقدار یکساں طور پر ہر طبقے کی ملک نہیں

ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادب تہذیبی ارتقا کا ایک جزو اور اس کا ترجمان بن کر زندگی کی اس کشمکش کو پیش کرتا ہے جو کبھی فرد اور جماعت کی کشمکش کی شکل میں رونما ہوتی ہے کبھی جماعت اور جماعت کی شکل میں اور ادب اس اظہار میں جس قدر زیادہ عمومی انداز اختیار کرتا یا زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زندگی کا ترجمان بنتا ہے، اسی قدر وہ تہذیب کے عمومی پہلوؤں سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

ہر ملک و قوم کا کوئی نہ کوئی تہذیبی سرمایہ ہوتا ہے چاہے وہ قوم بہت زیادہ متمدن نہ کہی جا سکے۔ پھر بھی وہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے بنیادیں رکھتی ہے، جس سے وہ آڑے وقتوں میں خود کو سنبھالتی ہے۔ اس کے گیت، رقص، موسیقی، قصے، کہانیاں، ضرب الامثال سب اس کے وجود کا جزو بھی ہیں اور مظہر بھی۔ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ گو یہ تمام چیزیں قومی خصوصیات رکھتی ہیں لیکن اس کا نصب العین انسانی ارتقا کی کوششوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو صدیوں کے انقلابات نے انھیں چکنا چور کر دیا ہوتا۔ یقیناً ہر بڑے تغیر کے بعد تہذیب اور ادب کا کچھ حصہ بیکار ہو کر ختم ہو جاتا ہے لیکن جو کچھ انقلابات کے جھٹکے سہ لینے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے وہ حقیقتاً ایک ملک اور قوم کی روح کا آئینہ دار ہوتا ہے، اس میں بقا کی جو قوت ہے، وہ اس قوم کی قوتِ بقا کا آئینہ ہے جو آزمایش اور انقلاب کی بھٹی میں تپائی گئی ہے۔

قومی ادب انسانی ادب بھی ہوتا ہے، اس کی مثال ہر قوم کے ادب و شعر میں مل سکتی ہے، کیونکہ جہاں تک انسانوں کے خوابوں اور ان کی تمناؤں کا سوال ہے، خوش اور مطمئن آسودہ حال اور ترقی پذیر زندگی بسر کرنے کی حد تک ان میں گہری یکسانیت پائی جاتی ہے۔ دوسروں کو غلام بنانے، تفرقے پیدا کرنے، لوٹ کھسوٹ کر کے خوشحال بننے کے جذبات، زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے جذبات کی طرح بنیادی اور خوب صورت نہیں ہیں۔ انھوں نے مخصوص سماجی اور سیاسی حالات میں جنم لیا اور ترقی کی ہے اس لیے ادب اپنی اصل شکل میں ان جذبات کی ترجمانی نہیں کرتا بلکہ اکثر انھیں ناپائدار اور تغیر پذیر اور قابل نفرت اور گھناؤنا بنا کر پیش کرتا ہے لیکن ساری دنیا کے ادب میں محبت کی پائداری اور زندہ رہنے کی خواہش، سماج میں توازن پیدا کرنے اور فطرت کو قابو میں لانے کی امنگ کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملے گی۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہر دور میں قومی تہذیب اور قومی زندگی ادب کو متاثر

کرتی ہے لیکن اس کے انھیں حصوں کو پائدار بنانے میں کامیاب ہوتی ہے، جو اس وسیع تر نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ باقی حصے زیادہ سے زیادہ تاریخی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اٹلی اور جرمنی کا وہ ادب جو مسولینی اور ہٹلر کی خون آشام خواہشات کا آئینہ دار ہے، اپنے ملک میں بھی مٹ چکا ہے۔ بین الاقوامی ادب کا جزو بننا تو بڑی بات ہے یہاں تک کہ مسولینی اور ہٹلر کی آپ بیتیاں دیکھنے کا شوق صرف تاریخ کے طالب علم رکھتے ہیں۔ اس ادب میں اٹلی اور جرمنی کی قومی زندگی (بلکہ سچ پوچھا جائے تو حاکم طبقہ اور اس کے معاونوں کی زندگی) کا وہ عارضی دور اپنی جھلک دکھاتا ہے جو انسانی نقطۂ نظر سے پسندیدہ نہیں کہا جا سکتا۔ فاشزم کے تاریک سائے میں پیدا ہونے والے ادب کی تہذیب دشمنی کا تجزیہ یہاں مقصود نہیں ہے صرف اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ ادب تہذیبی زندگی سے اسی وقت تعلق رکھتا ہے جب وہ اپنے اندر قوم کی منصفانہ اور انسان دوست تمناؤں کا اظہار کرے۔ اس کے کسی ایک طبقے کی جارحانہ اور ظالمانہ خواہشات کبھی تہذیب و ادب کا جزو نہیں بن سکتیں۔

ادب کو تہذیبی زندگی سے متعلق کرنے کے سلسلے میں جو اصل دشواری پیش آتی ہے، اور جس کا اظہار بہت سے لوگ کھل کر نہیں کر سکتے۔ یہ ہے کہ عام طور پر ادب کو محض فرد کی خیال آرائیوں اور شخصی تصورات کا اظہار سمجھا جاتا ہے۔ اس ضمن میں آرٹ میں انفرادیت کی بحث کے علاوہ فرد اور جماعت کے تعلق کی بحث بھی اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ادیب کی انفرادی خواہشات اور خیالات کو کسی قوم یا ملک کے مجموعی تہذیبی تصورات کا جزو کس طرح بنایا جا سکتا ہے! یہ حقیقت ہے کہ ادبیات کا بڑا حصہ افراد کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہوتا ہے اور اعلیٰ درجے کی تخلیق میں ادیب اور فن کار کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے، لیکن جس بات کو نظر انداز کر دینے سے یہ مسئلہ الجھن پیدا کرتا ہے وہ یہ ہے کہ بہت سے نقاد اور مفکر فرد اور جماعت میں کشمکش کو لازمی چیز تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ تحلیلِ نفسی کی عمارت کا بڑا حصہ اسی مفروضے پر قائم ہے کہ انسان سماج کے ساتھ مجبوراً تعاون کرتا ہے ورنہ اس کی انفرادیت تو سماج سے بالکل الگ ہی رہنا چاہتی ہے۔ یہی خیال دوسری الجھنوں تک لے جاتا ہے کیونکہ اس میں ایک طرف تو انسانی فطرت کو بعض جبلتوں کا مجموعہ قرار دیا جاتا ہے جو بدل نہیں سکتیں، اور دوسری طرف یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ کسی سماجی نظام میں افراد کو بہ حیثیت فرد کے مسرت حاصل کرنے اور اپنی جائز خواہشات پوری کرنے کا موقع مل ہی نہیں سکتا۔ یہ دونوں باتیں صحیح نہیں

ہیں، نہ تو انسانی فطرت غیر تغیّر پذیر ہے اور نہ سماج فرد کا دشمن ہے، اس لیے وہ ادیب جو اپنی انفرادیت کو سماج کے عام مفاد سے الگ لے جا کر اپنی خواہشات اور اپنے افکار کو لوگوں پر لادنا چاہتا ہے وہ گویا تہذیب کی ان اقدار کی مخالفت کرتا ہے جسے انسانوں کی عام جدوجہد نے صدیوں کی صبر آزما گھڑیوں کے بعد جنم دیا ہے اور اسے انسان کے مستقبل پر بھروسہ نہیں ہے بلکہ وہ اس اندھی جبلّت کا وکیل ہے جو کبھی نہیں بدلتی۔ ان عقاید کے ساتھ کوئی ادیب انسانوں کے تہذیبی ارتقا کا قائل ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کے یہاں ادب اور تہذیب کے تعلق کی جستجو فضول ہوگی کیونکہ اس کی وہ انفرادیت جو سماجی زندگی سے صرف اپنی یا اپنے چند ہم خیالوں کی بات منوانے کے لیے برسرِ پیکار ہے۔ عام تہذیبی زندگی کا جزو کبھی نہ بن سکے گی۔ اچھا ادیب اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے بھی اپنی ادبی جدوجہد کو سماج کے عام مفاد کے کام میں لاتا ہے اور اپنے خیالات کے پردے میں اجتماعی خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ادب ایک تہذیبی عمل ہے، اور تہذیب کا کوئی ادارہ محض فرد کی کاوش کا مرہونِ منّت نہیں ہے، اس میں قوم کی زندگی کا دل دھڑکنا چاہیے۔

ابھی درمیان میں قدروں کا ذکر آیا تھا۔ اس کے تعین کے سلسلے میں کبھی پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ قدریں تہذیب کے انھیں عناصر پر مشتمل ہوتی ہیں جو صدیوں کی تخلیقی اور تعمیری جدوجہد سے پیدا ہوتی ہیں اور جن سے ایک تہذیب اور اس کے عزیز رکھنے والے پہچانے جاتے ہیں، قدریں بدلتی رہتی ہیں، ان کی حدیں بدلتی رہتی ہیں لیکن تہذیب کے ہر دَور میں ان کا وجود پایا جاتا ہے۔ قدیم ادبیات میں اخلاق، انسان دوستی، محبّت اور فن کے مخصوص تصوّرات تھے جو اچھی تصانیف کی قیمت معین کرنے میں مدد دیتے تھے۔ وہ تصورات اس زمانے کے معاشی اقتصادی اور معاشرتی زندگی سے ہم آہنگ تھے اور انھیں اسی نظام نے پیدا کیا تھا جس کی بنیاد زراعتی پیداوار، اس کے پیدا کرنے کے طریقوں اور اس پر قبضہ رکھنے کی صورتوں پر تھی لیکن مختلف اسباب، ارتقائی اور انقلابی اثرات کی وجہ سے انسان کا علم، ذہن، اندازِ نظر اور تہذیبی تصوّرات کے متعلق اس کا نقطۂ نظر بدلا، فطرت پر قابو پانے کی جدوجہد میں اس نے اپنے کو بدل لیا نتیجہ یہ ہوا کہ ان قدروں میں بھی تبدیلی ہوئی جنھیں وہ عزیز رکھتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے جسم کی ساخت بدل گئی لیکن مشینوں نے اس کے ہاتھوں کی طاقت میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ دُوربین اور خوردبین نے اس کی بینائی بڑھا دی۔ انجن وغیرہ کی پیدائش نے اُس کی رفتار تیز

کردی اور ہر جگہ وہ اپنے کو زیادہ قادر اور توانا محسوس کرنے لگا۔ ایسے میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اس کے بہت سے توہمات باطل ہوئے ہوں گے اور بہت سے شکوک یا تو رفع ہوئے ہوں گے یا یقین میں بدلے ہوں گے۔ اس کو انسان کی قوت اور امکاناتِ عمل پر زیادہ بھروسہ پیدا ہو گا۔ اس کے خیالات نے پہلی حد بندیوں کو توڑ کر نئے امکانات کی روشنی میں سوچنا شروع کیا ہو گا۔ تبدیلی کا یہی مفہوم ہے کہ مادی حالات کے بدل جانے سے انسان کا شعور بھی بدلتا ہے۔ اب جو قدریں پیدا ہوں گی، ان میں نیا پن ہو گا، وسعت ہو گی، انسان کی طاقت پر بھروسہ ہو گا اور فطرت کے متعلق خیالات بدلے ہوئے ہوں گے لیکن اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ محبت کی جگہ نفرت، اخلاق کی جگہ بداخلاقی، انسان دوستی کی جگہ انسان دشمنی پیدا ہو گی۔ شروع میں کہا جا چکا ہے کہ عارضی طبقاتی استحصال کے ماتحت ایسا ہو سکتا ہے لیکن وہ کسی قوم کی ارتقائی تہذیبی زندگی سے ہم آہنگ نہ ہو گا اس لئے قدیم تہذیب کے وہ اجزا، جو انسان کی عظمت، زندگی کی بقا اور جدوجہد کے مظہر ہیں۔ کسی نہ کسی شکل میں نئی تہذیبی قدروں میں بھی جگہ پائیں گے۔ ان کے حاصل کرنے اور ان پر زور دینے کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ان کا وجود ختم نہیں ہو سکتا۔ یہ تسلسل زندگی کے تسلسل کا پتہ دے گا اور ایک قوم کو اس کے ماضی سے متعلق رکھنے میں بھی معین ہو گا اور زبان، ادب اور فنونِ لطیفہ اس تسلسل کے برقرار رکھنے میں بڑا حصہ لیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی قوم اپنی زبان کے بدلے جانے اور اپنے ادب سے غفلت برتنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔

اب اگر ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ادب تہذیبی قدروں کے اعلان و اظہار کا ذریعہ ہوتا ہے، اس سے کسی قوم اور ملک کی روح پہچانی جاتی ہے، تو ظاہر ہے کہ ان کے تحفظ کی ضرورت بھی ہے اور ادب ایک حیثیت سے ان کے تحفظ کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ یہاں ان ذرایع کی تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں ہے لیکن اصل حقیقت کی طرف اشارہ مفید ہو گا۔ کیا ادب خارجی زندگی کے بدلنے میں مدد دیئے بغیر محض داخلی کیفیات کی تبدیلی سے تہذیبی خدمت انجام دے سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب پر اس بات کا انحصار ہے کہ ادب کس طرح قومی زندگی کے بدلنے اور اُسے مالامال کرنے میں مدد دے سکتا ہے؟ یہ دورِ جدید کا اہم ترین فلسفیانہ بحث ہے کہ انسانی شعور مادی حالات کا عکس ہے یا مادی حالات انسان کے ذہن کی پیداوار ہیں اور یہ تصور پرست فلسفہ بھیس بدل بدل کر انسان کو بھٹکا رہا ہے کہ انسانی ذہن تغیر کا سب سے بڑا آلہ ہے،

لیکن جس نے بھی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور فلسفیانہ افکار کی تاریخ پڑھی ہے اُسے یقین ہو جائے گا کہ گو انسان ہی اپنی ضرورت یا ضروریات کے ماتحت مادی تغیر پیدا کرتا ہے لیکن اس مادی تغیر کے ذریعہ اس کا شعور بدلتا ہے، ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ضمیر میں انقلاب آجائے اور دنیا کا نقشہ بدل جائے۔

ذرائع پیداوار میں تغیر انسان کے عمل کی راہیں بدلتا اور اس کے غور و فکر کے طریقے متعین کرتا ہے۔ اس پر فلسفیانہ انداز میں بحث کی جا سکتی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ اس حقیقت کو زیادہ آسانی سے ذہن نشین کرائے گا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں فکر اور شعور کی اہمیت کا انکار مقصود نہیں ہے بلکہ اس کی پیدائش اور طریق عمل کا سوال ہے اور جس حیثیت سے بھی دیکھا جائے یہ معلوم ہو گا کہ انسانی شعور عام معاشی، معاشرتی تغیرات کی رَو میں بدلتا اور نئی راہوں پر گامزن ہوتا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو ادب کا کام بھی یہی رہ جاتا ہے کہ وہ انسانی شعور کو وسیع تر کرے لیکن یہ نہ بھول جائے کہ انسانی شعور خارجی حالات کے بدلنے سے بدلتا ہے محض کسی مصنف کے کہہ دینے یا کسی فن کار کے ظاہر کر دینے سے نہیں بدلتا۔ یوں ادب تہذیب کی بقاء اور ارتقاء میں شریک ہو جاتا ہے۔

ہمیشہ سے زیادہ اس وقت ادب اور ادیب آزمائش میں مبتلا ہیں کیونکہ جنگ کے خطرات کی وجہ سے تہذیب کی بقا خطرے میں ہے، غیر معمولی مادی ارتقاء کی وجہ سے یہ زمانہ غیر معمولی امکانات کا حامل ہے، کہیں یہ مادی ارتقاء انسان دوستی، امن اور انسانی بہبود کے کام میں لایا جا رہا ہے، اور کہیں اس کے برعکس طبقاتی مفاد کو برقرار رکھنے اور مضبوط بنانے کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ ادیبوں کو اپنی راہ منتخب کرنا اور قومی زندگی کے ان تہذیبی عناصر کو ابھارنا ہے جو تہذیب کو بچانے میں معاون ہوں گے، یہ فیصلہ ان حقائق کی روشنی میں کرنا ہو گا جو تاریخ فراہم کرتی ہے اور جس سے منہ موڑ کر ادیب محض کھوکھلی انفرادی خواہشات کا ترجمان بن کر رہ جائے گا اور اس کے الفاظ ان کروروں سینوں میں دھڑکن پیدا نہ کر سکیں گے جو امن اور ارتقاء بقائے انسانی اور بقائے تہذیب کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں، صرف یہی ایک صورت ہے جس سے ادب قومی رہتے ہوئے بھی انسانی تہذیب کا جزو بن جاتا ہے اور ہر اعلیٰ ادبی کارنامہ تہذیب عالم کے خزانے میں جگہ پاتا ہے۔

حصّہ نظم

میرؔ

(۱)

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمایش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے
میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

(۲)

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دلِ پُر خوں کی اک گلابی سے
جی ڈہا جائے ہے سحر سے آہ
رات گزرے گی کس خرابی سے
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
برقع اُٹھتے ہی چاند سا نکلا
داغ ہوں اس کی بے حجابی سے
کام تھے، عشق میں بہت پر میرؔ
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

(۳)

بیٹھے جی کو جیءِ دلدار سے جایا نہ گیا
اس کی دیوار کا سَر سے مِرے سایہ نہ گیا
وہ تو کل دیر تلک دیکھتا ایدھر کو رہا
ہم سے ہی حالِ تبہ اپنا دکھایا نہ گیا
پاسِ ناموسِ محبّت تھا کہ فرہاد کے پاس
بے ستوں سامنے سے اپنے اٹھایا نہ گیا
مہ نے آ سامنے شب یاد دلایا تھا اسے
پھر وہ تا صبح مِرے جی سے بھلایا نہ گیا
زیرِ شمشیرِ ستم میرؔ تڑپنا کیسا
سَر بھی تسلیمِ محبت میں ہلایا نہ گیا

(۴)

سحر گہہ عید میں دورِ سبُو تھا | پر اپنے جام میں تجھ بن لہُو تھا
غلط تھا آپ سے غافل گزرنا | نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تُو تھا
چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ | کہ ہر غنچہ دِلِ پر آرزو تھا
گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا | جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا
مگر دیوانہ تھا گل بھی کسو کا | کہ پیراہن میں سو جا گہ رفُو تھا

نہ دیکھا میرؔ آوارہ کو لیکن
غبار اِک ناتواں سا کو بکو تھا

غالبؔ

(۱)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں | خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں
میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا | بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم | ملّتیں جب مٹ گئیں اجزاے ایماں ہوگئیں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج | مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

(۲)

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے | آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار | یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں | کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید | جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

(۳)

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ — دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن — خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل — گرمئ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(۴)

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن — بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے — ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے
ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی — وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے
محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا — اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

مومن

(۱)

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

اس کو میں جا مریں گے مدد اے ہجومِ شوق
آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

کیا گل کھلے گا دیکھیے، ہے فصلِ گل تو دور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

(۲)

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے، کئی بے جاں ہوں گے

تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے

صبر یارب مری وحشت کا پڑے گا کہ نہیں
چارہ فرما بھی کبھی قیدیٔ زنداں ہوں گے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہو گی
پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہوں گے

عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

فانیؔ

(۱)

دیر میں یا حرم میں گزرے گی
عمر تیرے ہی غم میں گزرے گی

کچھ امیدِ کرم میں گزری عمر
کچھ امیدِ کرم میں گزرے گی

زندگی یادِ دوست ہے یعنی
زندگی ہے تو غم میں گزرے گی

اب کرم کا یہ ماحصل ہے کہ عمر
یادِ عہدِ ستم میں گزرے گی

دل کو یادِ نشاطِ وصل نہ چھیڑ
غم میں گزری ہے غم میں گزرے گی

حشر کہتے ہیں جس کو اے فانیؔ
وہ گھڑی شرحِ غم میں گزرے گی

(۲)

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچہ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں، دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا

فصلِ گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی قیدی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

لیجیے کیا دامن کی خبر اور دستِ جنوں کو کیا کہیے
اپنے ہی ہاتھ سے دل کا دامن مدت گزری چھوٹ گیا

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

نظیر اکبر آبادی

بنجارہ نامہ

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گوئیں پلا سر بھارا
کیا گیہوں چاول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

تو بدھیا لادے بیل بھرے جو پورب پچھم جاوے گا
کیا سود بڑھا کر لادے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا
دھن دولت ناتی پوتا کیا، اک کنبہ کام نہ آوے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تیری ڈھل جاوے گی
اک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے پاوے گی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاوے گی
دھی پوت جنوائی بیٹا کیا، بنجارن پاس نہ آوے گی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کیوں جی پر بوجھ اٹھاتا ہے ان گونوں بھاری بھاری کے
جب موت کا ڈیرا آن پڑا پھر دونے ہیں بیوپاری کے
کیا ساز جڑاو زر زیور کیا گوٹے تھان کناری کے
کیا گھوڑے زین سنہری کے کیا ہاتھی لال عماری کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

اکبر الہ آبادی

نغمۂ حسرت

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا
بُت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا
بزمِ یاراں سے پھری بادِ بہاری مایوس
ایک سر بھی اُسے آمادۂ سودا نہ ملا
گُل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش
طالبِ زمزمۂ بلبلِ شیدا نہ ملا
واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کر دیا کعبے کو گم اور کلیسا نہ ملا
رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگِ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا
سیّد اُٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسا نہ ملا
ہوشیاروں میں تو اک سے سوا ہیں اکبرؔ
مجھ کو دیوانوں میں لیکن کوئی تجھ سا نہ ملا

اقبال

شعاعِ امید

(۱)

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز، کبھی صبح، کبھی شام

مدّت سے تم آوارہ ہو پہنائے فلک میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریٔ ایّام

نے ریت کے ذروں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام

پھر میرے تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

(۲)

آفاق کے ہر گوشے سے اٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش

اک شور ہے مغرب میں اُجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش

مشرق نہیں گو لذّتِ نظارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش

پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے
اے مہرِ جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش

(۳)

اک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب

بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرّہ جہاں تاب

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب

اس خاک سے اُٹھے ہیں وہ غوّاصِ معانی
جن کے لیے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب

بت خانہ کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

چکبست

خاکِ ہند

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے — دریائے فیضِ قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے — اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عزّ و شاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پُرضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

اس خاکِ دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری — چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری — چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری

شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیِ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو — سرمد نے اس زمیں پہ صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ اُلفت بخشا اس انجمن کو — سینچا لہو سے اپنے راناؔ نے اس چمن کو

سب سُوربیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

دیوار و در سے اب تک ان کا اثر عیاں ہے — اپنی رگوں میں اب تک ان کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے — فردوسِ گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہے

کشمیر سے عیاں ہے جنّت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں — کرتے ہیں رقص ابتک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں — پستی سی آ گئی ہے پر دل کے حوصلوں میں

گل شمعِ انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حُبِّ وطن نہیں ہے خاکِ وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا　　دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا　　اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صورِ حُبِّ قومی اس خواب سے جگا دے　　بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سُنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے　　اُٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حُبِّ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سُرور ہو کر

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک　　رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک　　ہم بے کسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا　　آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرہ اس منزلِ کہن کا　　تلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا

گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

جوشؔ ملیح آبادی

رقیب فرشتے

صبح کے تارے سے تھی گلرنگ گردوں کی جبیں
مست تھی موجِ صبا کلیاں ابھی چٹکی نہ تھیں
آسماں پر کیف طاری تھا زمیں پر بے خودی
جھک چلا تھا چاند پھیکی پڑ چلی تھی چاندنی
ایک ہلکا سا تبسم تھا در و دیوار پر
جیسے میٹھی نیند کا جادو رُخِ گلنار پر
گر رہے تھے گنبدِ افلاک سے بے اختیار
خاک پر سیّال چاندی کے ہزاروں آبشار
آ رہی تھی نرم قدموں سے نسیمِ دل نواز
سرنگوں تھے بوستاں، کلیاں تھیں محوِ خوابِ ناز
صبح کے چہرے پہ تھی ہلکے دُھندلکے کی نقاب
گا رہا تھا بھیرویں، میٹھے سُروں میں ماہتاب

آ رہی تھی آسمانوں سے فرشتوں کی صدا
"کیا سہانا وقت ہے، صَلِّ علیٰ صَلِّ علیٰ"

ان صداؤں سے مگر میں کھا رہا تھا پیچ و تاب
اور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اُبھرا آفتاب
شکر کے سجدے کیے میں نے کہ دشمن بہہ گئے
خیریت گزری کہ قصے بڑھتے بڑھتے رہ گئے
میری معشوقہ پہ یہ بے عقل مرنے آئے تھے
کیا سمجھ کر صبح کی تعریف کرنے آئے تھے؟

میں تھا جب موجود، پھر یہ گانے والے کون تھے؟
میری سرحد میں فرشتے آنے والے کون تھے؟

ہم لوگ

دل کے ایواں میں لیے گل شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید سے سہمے ہوئے، اکتائے ہوئے
حُسنِ محبوب کے سیّال تصوّر کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے

غایتِ سود و زیاں، صورتِ آغاز و مآل
وہی بے سود تجسّس، وہی بے کار سوال
مضمحل ساعتِ امروز کی بے رنگی سے
یادِ ماضی سے غمیں، دہشتِ فردا سے نڈھال!

تشنہ افکار جو تسکین نہیں پاتے ہیں
سوختہ اشک جو آنکھوں میں نہیں آتے ہیں
اک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں
اور اک اُلجھی ہوئی موہُوم سی درماں کی تلاش
دشت و زنداں کی ہوس، چاکِ گریباں کی تلاش

ن۔م۔ راشد

زنجیر

گوشۂ زنجیر میں
اک نئی جنبش ہویدا ہو چلی
سنگِ خارا ہی سہی، خارِ مغیلاں ہی سہی
دشمنِ جاں، دشمنِ جاں ہی سہی ——
دوست سے دست و گریباں ہی سہی
یہ بھی تو شبنم نہیں ——
یہ بھی تو مخمل نہیں، دیبا نہیں، ریشم نہیں،

ہر جگہ پھر سینۂ نخچیر میں
اک نیا ارماں، نئی امید پیدا ہو چلی
حجلۂ سیمیں سے تو بھی پیلۂ ریشم نکل
وہ حسیں اور دُور افتادہ فرنگی عورتیں
تو نے جن کے حسن روز افزوں کی زینت کے لیے
سالہا بے دست و پا ہو کر بنے ہیں تارہائے سیم و زر
ان کے مردوں کے لیے بھی آج اک سنگین جال
ہو سکے تو اپنے پیکر سے نکال!

شکر ہے دنبالۂ زنجیر میں
اک نئی جنبش، نئی لرزش ہویدا ہو چلی

کوہساروں، ریگ زاروں سے صدا آنے لگی
ظلم پروردہ غلامو! بھاگ جاؤ
پردۂ شب گیر میں اپنے سلاسل توڑ کر
چار سو چھائے ہوئے ظلمات کو اب چیر جاؤ
اور اس ہنگام باد آورد کو
حیلۂ شبخوں بناؤ!

خاص خاص مطبوعات

اقبالیات

کلیات اقبال (اردو) صدی ایڈیشن ۲۰/..
فکر اقبال خلیفہ عبدالحکیم ۴۰/..
اقبال معاصرین کی نظر میں وقار عظیم ۲۰/..
اقبال شاعر اور فلسفی 〃 ۲۰/..
اقبال کی کہانی کچھ میری کچھ انکی زبانی ظہیر احمد جامعی ۱۰/..
اقبال فن اور فلسفہ ڈاکٹر نور الحسن نقوی ۷/۵۰
تصورات اقبال مولانا اصلاح الدین احمد ۱۵/..
بانگ درا (عکسی) علامہ اقبال ۱۰/..
بال جبریل 〃 〃 ۸/..
ضرب کلیم 〃 〃 ۸/..
ارمغان حجاز 〃 (اردو) ۴/۵۰

غالبیات

غالب: تقلید اور اجتہاد پروفیسر خورشید الاسلام ۲۰/..
غالب: شخص اور شاعر مجنوں گورکھپوری ۱۵/..
دیوان غالب (عکسی) نور الحسن نقوی ۱۰/..
اطراف غالب ڈاکٹر سید عبداللہ ۲۰/..

فیض

کلام فیض (عکسی) فیض احمد فیض ۲۰/..
نقش فریادی 〃 ۶/..
دست صبا 〃 ۶/..
زنداں نامہ 〃 ۷/۵۰
دست تہ سنگ 〃 ۶/..

لسانیات

اردو لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری ۱۲/..
اردو زبان و ادب ڈاکٹر مسعود حسین خاں ۷/۵۰

جمالیات

جمالیات اور ادب ڈاکٹر ثریا حسین ۱۵/..
ادب میں جمالیاتی اقدار ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ۲۰/..

مثنوی

اردو مثنوی کا ارتقاء عبدالقادر سروری ۷/۵۰
مثنوی گلزار نسیم ظہیر احمد صدیقی ۵/..
مثنوی سحر البیان 〃 ۵/..

افسانے

اردو کے تیرہ افسانے مرتبہ: ڈاکٹر اطہر پرویز ۱۲/..
منٹو کے نمائندہ افسانے مرتبہ: ڈاکٹر اطہر پرویز ۱۰/..
پریم چند کے نمائندہ افسانے ڈاکٹر قمر رئیس ۱۲/..
نیا افسانہ وقار عظیم ۱۵/..
نمائندہ مختصر افسانے محمد طاہر فاروقی ۵/..

ڈرامے

یونانی ڈراما عتیق احمد صدیقی ۲۰/..
اردو ڈراما کا ارتقاء عشرت رحمانی ۴۰/..
اردو ڈراما: تاریخ و تنقید 〃 ۲۰/..
آغا حشر اور اردو ڈراما انجمن آرا ۳۰/..
انارکلی ڈاکٹر محمد حسن ۵/..

ادب و تنقید

تنقیدیں پروفیسر خورشید الاسلام ۲۰/..
شناسا چہرے ڈاکٹر محمد حسن ۱۵/..
مضامین نو خلیل الرحمن اعظمی ۲۵/..
اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک 〃 ۴۰/..
تنقیدی تناظر ڈاکٹر قمر رئیس ۳۰/..
ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ رشید حسن خاں ۲۵/..
میں، ہم اور ادب ابن فرید ۲۰/..
غزل اور درس غزل اختر انصاری ۸/..
سرسید اور ہندوستانی مسلمان ڈاکٹر نور الحسن نقوی ۲۰/..
اردو ادب کی تاریخ عظیم الحق جنیدی ۷/۵۰
مقدمہ شعر و شاعری مقدمہ: ڈاکٹر وحید قریشی ۷/۵۰
نثر، نظم اور شعر منظر عباس نقوی ۷/۵۰
سرسید: ایک تعارف پروفیسر خلیق احمد نظامی ۲/۵۰
سرسید اور علی گڑھ تحریک 〃 ۲۵/..
ناول کا فن ابوالکلام قاسمی ۱۵/..
انتخاب مضامین سرسید آل احمد سرور ۵/..
نظم جدید کی کروٹیں وزیر آغا ۱۸/..
تنقید اور احتساب 〃 ۱۵/..
اردو شاعری کا مزاج 〃 ۴۰/..
تخلیقی عمل 〃 ۲۰/..
انسان اور آدمی محمد حسن عسکری ۱۰/..
ستارہ یا بادبان 〃 ۱۵/..
آج کا اردو ادب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۱۶/..
جدید شاعری ڈاکٹر عبادت بریلوی ۲۵/..
شاعری اور شاعری کی تنقید 〃 ۲۵/..
داستان سے افسانے تک وقار عظیم ۲۰/..
اکبر کی طنزیہ اور ظریفانہ شاعری محمد زاہد ۱۵/..
اسلوب سید عابد علی عابد ۲۰/..
بجنگ آمد کرنل محمد خاں ۱۲/..
باغ و بہار سلیم اختر ۱۰/..
نذیر احمد کی کہانی کچھ انکی کچھ میری زبانی فرحت اللہ بیگ ۲/۵۰
مجموعہ نظم حالی ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ۵/..
آب حیات کا تنقیدی تحقیقی مطالعہ سید سجاد ۵/..
تحقیقی تنقیدی مطالعہ باغ و بہار سلیم اختر ۹/..

کامرس

ہائر سکنڈری بک کیپنگ حصہ اول ڈاکٹر ... ۲۰/..
〃 حصہ دوم 〃 ۳۰/..
ایڈوانسڈ اکاؤنٹس 〃 ۲۵/..
جدید طریقہ و تنظیم تجارت (بزنس میتھڈ اینڈ آرگنائزیشن) 〃 ۲۰/..

سیاسیات و تاریخ

دنیا کی حکومتیں (ورلڈ کانسٹی ٹیوشن) محمد ہاشم قدوائی ۱۲/..
جمہوریہ ہند کا کانسٹی ٹیوشن (آف انڈیا) 〃 ۱۰/..
مبادی سیاسیات (ایلیمنٹس آف پالیٹکس) 〃 ۱۰/..
تاریخ تہذیب عالم (ورلڈ ہسٹری) اے۔ اے۔ ہاشمی ۱۵/..
اسلامی تاریخ 〃 ۵/..

متفرق

جدید تعلیمی مسائل ڈاکٹر ضیاء الدین علوی ۹/..
اصول تعلیم 〃 ۱۰/..
ہندوستان کا تہذیبی ورثہ 〃 ۲/۲۵
عام معلومات 〃 ۵/..
ایجادات کی کہانی 〃 ۵/..
تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے سرت زمانی ۲/..
رہبر صحت ۵/..
علم خانہ داری ۱۰/..
بچوں کی تربیت ۵/..
گلدستہ مضامین و انشاپردازی ڈاکٹر محمد عارف خاں ۶/۵۰
اردو صرف محمد انصار اللہ ۲/۷۵
اردو نحو ۱۵/..
فیروز اللغات (جیبی) ۴/..
فیروز اللغات اردو جدید (رنگین) ۲۵/..

ایجوکیشنل بک ہاؤس

مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱